



عظمتِ مومن

مولانا وحید الدین خاں

عظمتِ مومن

مولانا وحید الدین خاں

۲۸	ماضی اور حال	۴	عجیب لوگ
۳۰	رحمِ دل فاتح	۶	تاریخ کی آواز
۳۲	ظالم کا دل ہل گیا	۹	ایک باپ
۳۴	تاریخ کا ایک صفحہ	۱۲	مسلم حج
۳۶	ترکِ فاتح	۱۴	بارش شروع ہوگئی
۳۸	نا کامیوں کے بعد	۱۶	امکان ختم نہیں ہوتا
۴۰	میدانِ جنگ میں نماز	۱۸	اسلامی حکمراں
۴۲	حسد کے نقصانات	۲۰	اختلاف کے باوجود
۴۴	عالیٰ ظرفی	۲۲	پکار کے وقت
۴۶	سچائی کی فتح	۲۴	اسلامی شجاعت
۴۸	مفاہد کی قربانی	۲۶	تاریخ کا صفحہ

Azmat-e-Momin

First published 1985, Reprinted 2017
This book is copyright free

Goodword Books
A-21, Sector 4, Noida-201301, India
Tel. +9111-46010170, +9111-45651770
Mob. +91-8588822672
email: info@goodwordbooks.com
www.goodwordbooks.com

Printed in India

عجیب لوگ

ایران حضرت عمر فاروق کے زمانہ خلافت میں فتح ہوا ہے۔ اس وقت ایران کی مسلم افواج کے سپہ سالار حضرت سعد بن ابی وقاص تھے۔ اس جنگ میں ایرانیوں کا کافی نقصان ہوا۔ چنانچہ انہوں نے گفت و شنید کی پیش کش کی۔ حضرت سعد نے مختلف وفود کو رستم اور یزدگرد کے دربار میں بھیجا۔ مثلاً نعمان بن مقرن۔ فرات بن حیان۔ حنظلہ بن رزیح۔ عطار بن حاحب۔ اشعث بن قیس۔ مغیرہ بن شعبہ۔ عمرو بن محمد کرب کے وفود (البایہ والہمایہ)

تاریخ میں ان سفارتوں کی کافی تفصیلات آئی ہیں۔ آخری مرحلہ میں حضرت مغیرہ کا وفد شہنشاہ یزدگرد کے زرق برق دربار میں آیا۔ مدائن کے محل میں انھوں نے انتہائی بے خوفی کے ساتھ تقریر کی۔ یزدگرد اس کو سن کر بے گناہ گیا۔ اس نے کہا کہ تم میرے سامنے اس طرح کی باتیں کرتے ہو۔ اگر یہ قاعدہ نہ ہوتا کہ اپنی قتل نہ کئے جائیں تو میں تم کو ضرور قتل کر دیتا۔ اب تم واپس جا کر اپنے امیر کو بتا دو کہ میں سپہ سالار رستم کی سرکردگی میں ایسا لشکر بھیجے والا ہوں جو تم سب کو قادیسیہ کے خندق میں دفن کر دے گا۔

پھر یزدگرد نے محل کے آدمیوں سے کہا کہ ایک ٹوکری میں مٹی بھر کر لاؤ۔ مٹی لائی گئی تو اس نے مسلمانوں کے وفد سے مخاطب ہو کر پوچھا کہ تم میں سب سے زیادہ شریف کون ہے۔ وفد کے افراد چپ رہے۔ اس کے بعد عاصم بن عمرو بولے کہ میں سب سے زیادہ شریف ہوں۔ یزدگرد نے حکم دیا کہ مٹی کی ٹوکری عاصم بن عمرو کے گلے میں لٹکائی جائے اور ان کو یہاں سے بھگا دیا جائے یہاں تک کہ وہ مدائن کے باہر چلے جائیں۔

شاہی حکم کے مطابق مٹی کی ٹوکری عاصم بن عمرو کے گلے میں لٹکادی گئی۔ وہ اس کو لے کر مدائن کے محل سے نکلے اور اونٹنی پر سوار ہو کر تیزی سے قادیسیہ کی طرف روانہ ہوئے جہاں حضرت سعد بن ابی وقاص مقیم تھے۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے حضرت سعد کو ساری روداد سنائی اور مٹی کی ٹوکری ان کے سامنے رکھ دی۔ اس کے بعد مسلم سردار نے جو جواب دیا وہ یہ تھا :

ابشروا فقد والله اعطانا الله خوش ہو جاؤ۔ کیونکہ خدا کی قسم اللہ نے ہمیں ان کے
افتالید ملکم و تفاعلو ابذا لک اقتدار کی کنیاں دیدی ہیں۔ اور انھوں نے اس
اخذ بلادہم سے ان کے ملک پر قبضہ کی قال لی۔

یہ مسلمان اگر مٹی پا کر غصہ ہوتے تو ان کے حصہ میں نفرت اور شکایت کے سوا کچھ نہ آتا۔ مگر جب
وہ غصہ نہیں ہوئے تو مٹی دینے کا واقعہ ان کے لئے ملک دینے کے ہم معنی بن گیا۔ ایک انتہائی
ناخوش گوار واقعہ سے بھی انھوں نے اپنے لئے یقین اور حوصلہ کی غذا حاصل کر لی۔

یہی موجودہ دنیا میں ترقی اور کامیابی کا راز ہے۔ موجودہ دنیا میں ہر شخص اور ہر گروہ کو مکمل
آزادی حاصل ہے۔ اس آزادی نے موجودہ دنیا کو مقابلہ (Competition) کی دنیا بنا دیا ہے۔
یہاں ہر آدمی دوسرے آدمی کی کاٹ میں ہے۔ ہر گروہ دوسرے گروہ کو دھکیل کر آگے بڑھ جانا
چاہتا ہے۔

ایسی حالت میں ایک صورت یہ ہے کہ آدمی غصہ اور جھنجھلاہٹ میں مبتلا ہو۔ وہ انتقامی
نفیات میں جلتا رہے۔ ایسے آدمی کا ذہن ہمیشہ منتشر رہے گا۔ وہ کبھی گہری منصوبہ بندی نہ کر سکے گا۔
ایسے آدمی کے لئے موجودہ دنیا میں ناکامی اور بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو رد عمل کی نفیات سے بچائے۔ وہ اشتغال کے
بادوجود مشغول نہ ہو۔ ایسے آدمی کا ذہن ہمیشہ اعتدال کی حالت میں رہے گا۔ وہ اپنے منفی اور مثبت
پہلوؤں کو کسی کمی بیشی کے بغیر جان لے گا۔ اس کے لئے یہ ممکن ہو گا کہ وہ تمام حقیقتوں کو نگاہ میں
رکھے اور حالات کے عین مطابق منصوبہ بندی کرے۔ ایسے شخص کے لئے کامیابی اتنی ہی یقینی ہے
جتنی رات کے بعد سورج کا نکلنا۔

جو شخص اپنے آپ کو رد عمل کی نفیات سے بچائے اس کی سوچ نہایت اعلیٰ سوچ بن جاتی ہے۔
اس کی نظر ہمیشہ امکانات پر ہوتی ہے۔ وہ مٹی کی ٹوکری میں پورے ملک کی تصویر دیکھ لیتا ہے۔
حوصلہ شکنی کے واقعات اس کے ذہنی خانہ میں داخل ہو کر حوصلہ مندی کے واقعات بن جاتے ہیں۔
یہی وہ لوگ ہیں جو شکست کو فتح میں تبدیل کرتے ہیں۔ وہ ناکامی میں کامیابی کا راز
دریافت کر لیتے ہیں۔

تاریخ کی آواز

حضرت عرف روق کی خلافت کے زمانہ میں ۱۲۷ھ میں ایران فتح ہوا۔ اس زمانہ میں لوگوں کے ذہن پر ایرانی شہنشاہ کی اتنی عظمت تھی کہ حضرت عمرؓ اس مہم کی سربراہی کے لیے خود مدینہ سے روانہ ہونے کے لیے تیار ہو گئے۔ مگر لوگوں نے اس کے خلاف مشورہ دیا۔ چنانچہ ایک صحابی حضرت سعد بن ابی وقاص کو اس مشکل مہم کا سپہ سالار بنایا گیا۔

اس مہم کا آخری معرکہ قادسیہ کے قریب ایک میدان میں ہوا۔ یہاں میدان جنگ کے کنارے ایک قدیم شاہی عمارت تھی۔ حضرت سعدؓ اس کی چھت پر چڑھے اور میدان کی طرف رخ کر کے تکیہ کے سہارے بیٹھ گئے۔ وہ جنگ میں خود شریک نہیں ہوئے۔ اپنی جگہ خالد بن عرفطہ کو میدان مقابلہ کا سردار مقرر کیا۔ حضرت سعد عمارت کے اوپر بیٹھے ہوئے مسلسل جنگ کا مشاہدہ کر رہے تھے اور حسب ضرورت اپنی ہدایات پرچی پر لکھ کر خالد بن عرفطہ کے پاس بھیجے رہتے تھے۔

یہ جنگ اسلامی تاریخ کی انتہائی ہولناک جنگ تھی۔ اس جنگ میں ایرانی ہاتھیوں کی فوج لائے تھے جن کا اس سے پہلے عربوں نے تجربہ نہیں کیا تھا۔ ایک موقع پر ہاتھیوں کی کالی آندھی نے مسلمانوں کو پیچھے ہٹا دیا۔ حضرت سعد یہ دیکھ کر بے تاب ہو گئے اور بار بار کہہ دینے لگے۔ حضرت سعد کی اہلیہ سلیٰ جو اس وقت ان کے پاس تھیں، یہ دیکھ کر بول اٹھیں ”کاش آج مثنیٰ ہوتا“ حضرت سعد نے سلیٰ کو تحقیر مار کر کہا۔ ”مثنیٰ ہوتا تو وہ کیسا کر لیتا“ سلیٰ نے جواب دیا۔ ”سبحان اللہ، بزدلی کے ساتھ غیرت بھی“ سلیٰ نے یہ بات اس لیے کہی کہ حضرت سعدؓ خود لڑائی میں شریک نہیں تھے۔

اس کے بعد تاریخ لمبی تفصیل بیان کرتی ہے کہ کس طرح مسلمانوں نے ایران کی فوجی تیاریوں کا مقابلہ کیا اور بالآخر ثمار فتح حاصل کی۔

اس جنگ میں ایرانیوں کا سردار رستم تھا۔ رستم کو ہلال نامی ایک مسلمان سپاہی نے قتل کیا۔ اگرچہ فردوسی نے غلطی سے یہ سبھا ہے کہ رستم کا مقابلہ حضرت سعدؓ سے ہوا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے شاہنامہ میں لکھا ہے :

زیک سوئے رستم زیک سوئے سعد

حضرت سعدؓ کے براہ راست جنگ میں شریک نہ ہونے کی وجہ سے اس وقت فوج کے اندر کافی چرمیگوئیاں ہوئیں۔ ایرانیوں کی شکست کے بعد ایک مسلمان فوجی نے نظم کہی جس کے دو اشعار یہ تھے :

وَقَاتَلْتُ حَتَّى أُنْزِلَ اللَّهُ نُصْرًا وَسَعَدُ بِبَابِ الْقَادِسِيَّةِ مُعْصِمٌ
فَابْتَنَّا وَقَدْ أَمِنَتْ نِسَاءُ كَثِيرَةٌ وَلَيْسَ مَعَهُ لَيْسَ فِيهِمْ أَتَمُّ

میں لڑا یہاں تک کہ اللہ نے اپنی مدد بھیجی۔ اور سعد قادیسیہ کے دروازے سے پلٹے رہے۔ پھر ہم واپس ہوئے اور بہت سی عورتیں بیوہ ہو چکی تھیں۔ اور سعد کی بیویوں میں سے کوئی بیوی بیوہ نہیں ہوئی۔

حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نہایت جلیل القدر صحابی تھے۔ وہ اسلام کے بڑے بڑے مجاہدوں میں شامل تھے۔ لیکن مذکورہ واقعہ کو اگر اس کی ظاہری صورت میں لیا جائے تو ایک شخص یہ رائے قائم کرے گا کہ نعوذ باللہ وہ ایک بزدل آدمی تھے۔ انھوں نے دوسروں کی عورتوں کو بیوہ بنایا اور خود اپنی بیوی کے ساتھ شاہی قلعہ میں محفوظ بیٹھے رہے۔

مگر یہ شبہ صرف اس وقت ہوتا ہے جب کہ اصل واقعہ کو ادھوری شکل میں دیکھا جائے۔ واقعہ کو پوری شکل میں دیکھیے تو یہ شبہ باقی نہ رہے گا۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص کو عرق النسا کی بیماری تھی۔ اور وقفہ وقفہ سے اس کے دورے پڑتے رہتے تھے۔ ایرانی جنگ کی ابتدا میں وہ ٹھیک حالت میں تھے۔ چنانچہ قادیسیہ کے آخری معرکہ سے پہلے دوسری جنگوں میں وہ براہ راست شریک رہے۔ مگر قادیسیہ کے معرکہ کے موقع پر ان کو عرق النسا کا شدید دورہ پڑا ہوا تھا۔ وہ اس وقت چلنے پھرنے سے بالکل معذور تھے۔ اس بنا پر مقابلہ میں براہ راست شریک نہیں ہو سکتے تھے۔ مگر ان کے جنگی تجربات اور ان کی اعلیٰ ذہانت کی وجہ سے حضرت عمرؓ نے ان کو بدستور سپہ سالاری کے عہدہ پر باقی رکھا۔ اگرچہ وہ عملی طور پر جنگ میں شریک نہ تھے مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کی رہنمائی اور ان کی منصوبہ بندی ہی کی وجہ سے اس معرکہ کا فیصلہ مسلمانوں کے حق میں ہوا۔

ان کی جنگی ذہانت کا ایک ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے عین معرکہ کے وقت ایران کی ہاتھیوں کی فوج کا حل دریافت کیا جس نے کالی آندھی کی طرح مسلمانوں کو روندنا شروع کر دیا تھا۔ عرب ذہن کے لیے یہ بالکل ایک نیا مسئلہ تھا اس لیے وہ اس کا حل سوچنے سے عاجز ہو رہے تھے۔ حضرت سعدؓ نے یہ کیا کہ ان ایرانیوں کو بلایا جو پہلے پارسی تھے اور اب مسلمان ہو گئے تھے۔ ان کے نام صنم اور سلم وغیرہ تاریخوں میں آئے ہیں۔

حضرت سعدؓ نے ان ایرانی نو مسلموں سے پوچھا کہ اس کالے طوفان کا کیا علاج ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ان کا حل یہ ہے کہ کسی طرح ان کے سونڈ اور ان کی آنکھیں بے کار کر دی جائیں۔

اس کے بعد حضرت سعدؓ نے مسلم فوج سے کچھ خاص جوانوں کو طلب کیا۔ ان کو پوری بات سمجھائی اور ان کو ابھارا کہ تم جان پر کھیل اس مہم کو سر کر دو۔ چنانچہ قعقاع اور کچھ دوسرے جوانوں نے دو ہاتھیوں کو منتخب کیا۔ یہ دونوں ہاتھی جسامت میں سب سے بڑے تھے اور بقیہ ہاتھیوں کے لیے سردار کا کام کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک ہاتھی کا نام امیض تھا اور دوسرے کا نام اجرب۔ مسلم جوانوں نے ان دونوں ہاتھیوں کو نہنے میں لے لیا۔ انھوں نے نہایت پھرتی سے برجھا مار کر ان کی آنکھوں کو بے کار کر دیا۔ اس کے بعد سونڈ پر اتنے زور سے تلوار ماری کہ وہ کٹ کر الگ ہو گئی۔ اب دونوں ہاتھی پیچھے کی طرف بھاگے۔ ان کو دیکھ کر بقیہ ہاتھی بھی ان کے ساتھ مڑ کر پیچھے کی طرف بھاگنے لگے۔ ہاتھیوں کی جو فوج پہلے مسلمانوں کو روند رہی تھی اس نے انتہائی بے دردی کے ساتھ خود ایرانی فوج کو روند ڈالا۔

حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کے مذکورہ واقعہ میں دو بہت بڑے سبق ہیں۔ ایک یہ کہ کسی شخص کے خلاف کوئی بات سامنے آئے تو آدمی کو کبھی ایسا نہیں کرنا چاہیے کہ وہ اس کو فوراً مان لے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ معاملہ کی پوری جانچ کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اصل بات اس سے بالکل مختلف تھی جو بظاہر ابتدائی رپورٹ سے سامنے آئی تھی۔ جس خبر میں کسی کے خلاف بدگمانی کا پہلو ہو اس کو مکمل تحقیق کے بغیر مان لینا سراسر ایمانی تقاضے کے خلاف ہے۔

دوسرا سبق وہ ہے جس کا ثبوت قادسیہ کے موقع پر عرب فوجیوں نے دیا۔ انھیں اپنے سردار سے زبردست شکایت تھی۔ حتیٰ کہ اس شکایت کا اظہار انھوں نے اشعار کی صورت میں کیا اور وہ اشعار تمام فوجیوں کے درمیان پھیل گئے۔ اس کے باوجود ایسا نہیں ہوا کہ لوگ اپنے سردار سے بغاوت کر دیں یا جنگ میں بے جگری کے ساتھ نہ لڑیں۔ سردار سے شکایت کے باوجود وہ اپنا فرض بھر پور طور پر ادا کرتے رہے۔

یہی وہ لوگ ہیں جو تاریخ بناتے ہیں۔ اور جن لوگوں کے اندر یہ مزاج نہ ہو وہ صرف یہ کریں گے کہ آپس میں لڑ بھڑا کر بنتے ہوئے کھیل کو بگاڑ دیں اور ایک جنگ جو جیت پر ختم ہونے والی تھی اس کو شکست اور ناکامی میں تبدیل کر دیں۔

ایک باپ

اموی خلیفہ مروان بن الحکم نے اپنے بعد علی الترتیب عبد الملک اور اس کے بعد اپنے بھائی عبد العزیز کو خلافت کے لئے نامزد کیا تھا۔ مروان کے بعد عبد الملک حکمران ہوا تو اس کی نیت بڑی جلد ہی بعد عبد العزیز کا انتقال ہو گیا۔ اب عبد الملک کو موقع مل گیا۔ اس نے ولید اور سلیمان کی ولی عہدی پر بیعت لینے کے لئے صوبوں کے حاکموں کے نام فرمان جاری کر دیے۔ ہشام بن اسماعیل مدینہ کا حاکم تھا۔ سعید بن المسیب (۹۴-۱۱۳) جو سید التابعین کہے جاتے ہیں، اس وقت مدینہ میں موجود تھے۔ ہشام نے چاہا کہ سب سے پہلے حضرت سعید بن المسیب سے بیعت لے۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اگر انہوں نے بیعت کر لی تو اس کے بعد تمام اہل مدینہ بیعت کر لیں گے۔

سعید بن المسیب نے بیعت سے انکار کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ میں ایک خلیفہ کی زندگی میں دوسرے خلیفہ کے لئے بیعت نہیں کر سکتا۔ ہشام کے حکم سے سعید بن المسیب کو کوڑے مارے گئے اور سخت سزا دی گئی۔ چند دن کے بعد ہشام نے ابو بکر بن عبد الرحمن کو ان سے بات کرنے کے لئے بھیجا۔ واپسی کے بعد ہشام نے پوچھا: کیا سعید مار کے بعد کچھ نرم پڑے۔ ابو بکر بن عبد الرحمن نے جواب دیا: تمہارے اس سلوک کے بعد خدا کی قسم وہ پہلے سے بھی زیادہ سخت ہو گئے ہیں۔ بہتر ہے کہ تم اپنا ہاتھ روک لو۔

خلیفہ عبد الملک کو معلوم ہوا تو اب اس نے دوسری تدبیر سوچی۔ سعید بن المسیب کی ایک لڑکی تھی جو صورت اور سیرت دونوں میں ممتاز تھی۔ اسی کے ساتھ اس نے وقت کے مطابق، اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ عبد الملک نے سوچا کہ ولی عہد سے اس لڑکی کا نکاح کر دیا جائے۔ اس کے بعد لڑکی کے باپ سعید بن المسیب اپنے آپ نرم پڑ جائیں گے۔ خلیفہ نے امیر مدینہ ہشام بن اسماعیل المخدومی کے ذریعہ کام سپرد کیا کہ وہ سعید بن المسیب کو اس رشتہ کے لئے راضی کرے۔

ہشام نے خلیفہ کے حکم کی تعمیل میں سعید بن المسیب سے ملاقات کی۔ پہلے ادھر ادھر کی باتیں کیں، اس کے بعد کہا: جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، عبد الملک بن مروان نے اپنے بیٹے ولید کی آئندہ خلافت کے لئے لوگوں سے بیعت لینے کا ارادہ کیا ہے، بیعت لینے سے پہلے، امیر المؤمنین یہ چاہتے ہیں کہ آپ ولید کو اپنی دامادی میں لے لیں۔ یہ سنتے ہی سعید بن المسیب کے چہرہ پر غصہ کے آثار ظاہر ہو گئے۔ انہوں

نے کہا: مجھے ان دونوں میں سے کوئی چیز بھی منظور نہیں۔

اس انکار کے بعد سعید بن المسیب کو دوبارہ مختلف قسم کی سختیاں بھیجی پڑیں۔ ان پر طرح سے دباؤ ڈالے گئے۔ مگر وہ برابر اپنے انکار پر قائم رہے۔ اسی کے ساتھ وہ خاموشی سے یہ سوچتے رہے کہ کوئی مناسب رشتہ سامنے آئے تو لڑکی کا عقد کر دیا جائے۔ آخر کار انھوں نے قریش کے ایک غنیہ معروف طالب علم ابو داعمہ کے ساتھ اپنی لڑکی کا نکاح کر دیا۔ مورخ ابن قسطلان (۶۸۱ - ۷۶۸) نے ابو داعمہ کے الفاظ میں یہ واقعہ مکمل طور پر نقل کیا ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے۔ ابو داعمہ کہتے ہیں:

میں سعید بن المسیب کے حلقہٴ درس میں نہایت پابندی سے بیٹھا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ کچھ مدت تک حاضر نہ ہو سکا۔ اس کے بعد جب گیا تو انھوں نے پوچھا، اتنے دنوں تم کہاں تھے۔ میں نے جواب دیا کہ میری بیوی کا انتقال ہو گیا تھا، اس وجہ سے حاضر نہ ہو سکا۔ انھوں نے کہا، پھر میں تم نے کیوں نہ خبر لی۔ ہم بھی اس کی تجہیز و تکفین میں شریک ہوتے۔

اس کے بعد جب میں اٹھے لگا تو انھوں نے کہا، تم نے دوسری بیوی کا کوئی انتظام کیا۔ میں نے کہا خدا آپ پر رحم فرمائے۔ کون میرے ساتھ اپنی لڑکی کا نکاح کرے گا جب کہ میں چند درہم سے زیادہ کی حیثیت کا آدمی نہیں ہوں۔ انھوں نے کہا، اگر میں کروں تو تم کرنے کے لئے تیار ہو۔ میں نے کہا بہت خوب۔ اس سے بہتر کیا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے اللہ کی حمد بیان کی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجا اور اسی وقت دو یا تین درہم پر میرے ساتھ اپنی لڑکی کا نکاح پڑھا دیا۔

ابو داعمہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد میں وہاں سے اٹھا اور میری خوشی کا یہ عالم تھا کہ میری بگھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیسے کروں۔ میں اپنے مکان پر پہنچا اور اس فکر میں پڑ گیا کہ اب رخصتی وغیرہ کے لئے قرض کہاں سے حاصل کروں۔ میں نے مغرب کی غار پڑھی اور اس دن میں روزہ سے تھا۔ نماز کے بعد میں نے چاہا کہ کھانا کھاؤں جو کہ روٹی تھا اور زیتون کا تیل۔ اتنے میں دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ میں نے پوچھا کون ہے؟ آواز آئی "سعید" میں نے سعید بن مسیب کو چھوڑ کر اس نام کے ہر شخص کا تصور کیا۔ کیوں کہ سعید بن مسیب تو چالیس برس سے اپنے گھر اور مسجد کے علاوہ کہیں دیکھے نہیں گئے تھے۔ اٹھ کر دروازہ کھولا تو وہاں سعید بن مسیب کھڑے تھے۔ ان کو دیکھ کر محال ہو کہ شاید ان کا خیال بدل گیا ہے اور وہ فسخ نکاح کرانے آئے ہیں۔

میں نے کہا "اے ابو محمد، آپ نے کیوں زحمت فرمائی۔ مجھے بلا بھیجا ہوتا۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں، اس وقت مجھ کو ہی تمہارے پاس آنے کی ضرورت تھی۔ میں نے کہا پھر کیا حکم ہے؟ انھوں نے کہا، مجھے خیال آیا کہ تم اپنے گھر میں تنہا ہو گے، حالانکہ اب تو تمہاری شادی ہو چکی ہے۔ مجھے گوارا نہیں ہوا کہ تم تنہا رہ کر رہو، اور یہ ہے تمہاری بیوی۔" اس وقت ابن مسیب کی صاحبزادی ٹھیک ان کے پیچھے کھڑی تھیں۔ انھوں نے صاحبزادی کو دروازہ کے اندر کر کے باہر سے خود ہی دروازہ بند کر دیا اور واپس چلے گئے۔ میری بیوی شرم کے مارے گر پڑی، پھر میں نے اندر سے دروازہ بند کیا اور اس کے بعد چھت پر چڑھ کر پڑوسیوں کو آواز دی۔ وہ لوگ جمع ہوئے اور پوچھا قصہ کیا ہے۔ میں نے کہا، سعید بن مسیب نے آج اپنی لڑکی کا عقد میرے ساتھ کر دیا۔ اور آج ہی اچانک وہ اسے میرے گھر بھی پہنچا گئے۔ اور وہ یہاں گھر میں موجود ہے۔ لوگوں نے آکر اسے دیکھا اور میری ان کو خبر ہوئی تو وہ بھی آگئیں اور انھوں نے کہا، اس کو چھونا تمہارے لئے حرام ہے جب تک میں حسب دستور تین دن تک اسے بنا سنوار نہ لوں۔ چنانچہ میں تین دن تک رکا رہا۔ اس کے بعد اس کے پاس گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ ایک حسین و جمیل خاتون ہے۔ کتاب اللہ کی حافظ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی عالم ہے۔ اور حقوق شوہری کو خوب پہچاننے والی ہے۔

ابوود احمد بیان کرتے ہیں کہ اس کے بعد ایک ماہ تک میں گھری پر رہا۔ اس دوران میں سعید بن مسیب کا نہ کوئی حال ملا اور نہ ان سے ملاقات ہوئی۔ پھر ایک مہینہ کے بعد میں ان کی صحبت میں حاضر ہوا۔ اس وقت وہاں مجلس قائم تھی۔ میں نے سلام کیا۔ انھوں نے سلام کا جواب دیا۔ اس کے بعد کوئی بات چیت نہ کی۔ یہاں تک کہ جو لوگ مسجد میں تھے سب چلے گئے۔ اس کے بعد جب میرے سو اکوئی وہاں نہیں رہ گیا تو انھوں نے پوچھا۔ تمہارے ساتھی کا کیا حال ہے۔ میں نے کہا، بہترین حال ہے۔ انھوں نے فرمایا: ان رابك شئ فاعصا۔ یعنی وہ کوئی ناپسندیدہ حرکت کرے تو اس کو مارو۔

پھر میں اپنے گھر لوٹ آیا۔ اور یہ سعید بن مسیب کی لڑکی وہ تھی جس کے لئے خلیفہ عبد الملک بن مروان نے اپنے لڑکے ولید کا پیغام دیا تھا جب اس نے اس کو ولی عہد بنایا تھا، تو سعید بن مسیب نے شہزادہ ولید سے رشتہ کرنے سے انکار کیا۔ جس کی وجہ سے عبد الملک سعید بن مسیب کے پیچھے پڑ گیا۔ یہاں تک کہ سخت سردی کے دن میں انھیں کوڑے سے پٹایا گیا اور اوپر سے ٹھنڈا پانی ڈالا گیا۔

مسلم حج

قاضی شریک بن عبید اللہ بن ابحارث النخعی مشہور عالم اور فقیہ ہیں۔ وہ بخاری میں ۹۵ھ (۶۸۳ء) میں پیدا ہوئے۔ کوفہ میں ۱۷۷ھ (۸۹۳ء) میں ان کی وفات ہوئی۔ خلافت عباسی کے زمانہ میں ۱۵۳ھ میں وہ کوفہ کے قاضی مقرر ہوئے۔

قاضی شریک کا ایک واقعہ یہ ہے کہ ایک عورت ان کے پاس یہ شکایت لے کر آئی کہ کوفہ کے حاکم موسیٰ بن عیسیٰ (خلیفہ مہدی کے چچا) کے ہاتھ جب وہ اپنا باغ فروخت کرنے پر راضی نہیں ہوئی تو انھوں نے اپنے غلاموں کو حکم دیا اور انھوں نے باغ کے حدود اور نشانات مٹا دیے اور اس کو امیر موسیٰ کے باغ میں ملا دیا۔

قاضی شریک نے امیر موسیٰ کے یہاں کہلوایا کہ وہ عدالت میں عورت کے ساتھ حاضر ہوں۔ امیر نے کوفہ کے پولیس افسر کو قاضی کے پاس بھیجا تاکہ وہ ان سے گزارش کریں کہ وہ اس معاملہ میں دخل دینے سے باز رہیں۔ قاضی نے پولیس افسر کو پکڑ کر قید کر دیا۔ جب امیر موسیٰ کو اس کی خبر ہوئی تو انھوں نے بعض درمیانی افراد کو بھیجا۔ انھوں نے قاضی کو ان کے اس فعل پر ملامت کی۔

قاضی شریک نے ان لوگوں سے کہا کہ امیر نے کیوں اپنے آپ کو عدالت کی ماضی سے بالاتر سمجھا۔ کیا عدالت صرف عوام کے درمیان فیصلہ کرنے کے لیے ہے۔ عدالت بلاشبہ بڑے اور چھوٹے کے درمیان فرق نہیں کرے گی۔ اور تم نے عدالت کے معاملہ میں مداخلت کی ہے۔ ضروری ہے کہ تم کو اس کی سزا دی جائے۔ پھر قاضی نے ان لوگوں کو قید کرنے کا حکم دے دیا۔ اس کے بعد امیر موسیٰ اپنے محافظ سواروں کے ساتھ قید خانہ گئے اور قیدیوں کو بزور اس سے نکال دیا۔

اس کے بعد قاضی شریک سفر کر کے بغداد گئے۔ تاکہ خلیفہ مہدی سے ملیں اور اس سے یہ کہیں کہ وہ ان کو قضا کے عہدہ سے الگ کر دے۔ انھوں نے خلیفہ سے کہا: خدا کی قسم، میں نے بنو عباس سے قاضی کا عہدہ نہیں مانگا تھا، خود انھیں نے مجھ کو یہ عہدہ قبول کرنے پر مجبور کیا، اور انھوں نے ہم سے وعدہ کیا تھا کہ ہم با اختیار اور آزاد ہوں گے۔ اگر ہم کو قاضی بنایا گیا تو ہم اپنے فیصلے پوری طرح مدلل کے مطابق کریں گے۔ مگر اب قاضی کے عہدہ پر باقی رہنے کی کوئی صورت

نہیں ہے جب کہ ہم دیانت دارانہ فیصلہ کرنے میں بے بس ہیں۔

پھر امیر موسیٰ نے قاضی سے ملاقات کی اور ان سے مہربانی کی درخواست کی۔ قاضی شریک نے کہا کہ میرے نزدیک اس کا حل صرف یہ ہے کہ وہ تمام لوگ دوبارہ قید خانہ میں لوٹائے جائیں جن کو قید کیے جانے کا میں نے حکم دیا تھا۔ چنانچہ امیر موسیٰ نے مجبور ہو کر تمام لوگوں کو دوبارہ قید خانہ میں واپس کیا۔ اور خود عورت کے ساتھ عدالت میں حاضر ہوئے۔ پھر قاضی شریک نے یہ فیصلہ دیا کہ امیر عورت کے باغ کو اسے لوٹائے اور جو حدود اور نشانات دُھار دیے گئے تھے ان کو دوبارہ قائم کرے چنانچہ اس حکم کا نفاذ کیا گیا :

روى ان القاضي (شريك بن عبید الله) قد شكت اليه امرأة من انها عند ما امتنعت عن بيع بستانها للامير موسى بن عيسى عم امير المؤمنين المهدي امر غلامه فزالوا حدود بستانها ومعاله — وخطوه ببستانه ، فارسل يستدعي الامير للحضور في مجلس القضاء مع المرأة — فارسل الامير رئيس الشرطة بالكوفة ليطلب منه العدول عن هذا فحبس رئيس الشرطة ، ولما علم الامير بذلك بعث بعض الوسطاء يعقبون على القاضي فقال لهم (شريك) لماذا ترفع الامير عن الحضور الى مجلس الحكم؟ هل نصب القضاء للفصل بين العامة فحسب ، ان العدالة لا تفرق بين امير و صغير ، وانتم بتدخلكم في امر القضاء لا بد ان يحل بكم جزاء ، ثم امر بجمعهم فلذهب الامير في ركب من حراسه الى السجن واخرج المسجونين عنوة فاعد القاضي نفسه للسفر الى بغداد للقاء الخليفة المهدي ليطلب اعفاءه من القضاء قاتلاً : (والله ما طلبت من بني العباس ولا بية القضاء ، وانما هم الذين اكرهونا عليها. ولقد وعدونا ان نكون اعز احراراً نتوخى العدل في احكامنا ان تولينا القضاء. اما الآن فلا سبيل الى البقاء في مجلس الحكم مادامنا عاجزين عن اداء الامانة) فلحق به الامير واخذ يستعطفه فقال : الحل عندي ان يرد الى السجن جميع من امرت بسجنهم فاضطرا لامير الى اعادتهم الى السجن والى حضور مجلس القضاء مع المرأة ، وحكم عليه شريك برد البستان ، واقامة الحدود والمعالم التي هدمت فنفذ الحكم۔

بارش شروع ہو گئی

چوتھی صدی ہجری کا واقعہ ہے۔ اندلس میں سلطان عبدالرحمن الناصر کی حکومت تھی۔ اس کا دارالسلطنت قرطبہ تھا۔ قاضی منذر بن سید اس وقت قرطبہ کے قاضی تھے اور اسی کے ساتھ وہ قرطبہ کی جامع مسجد میں نماز کی امامت کی خدمت بھی انجام دے رہے تھے۔ وہ بہت اچھے خطیب تھے اور اسی کے ساتھ بہت بڑے عالم بھی۔

سلطان عبدالرحمن الناصر کو عمارتوں کا بہت شوق تھا۔ اس نے الزہرار کے نام سے ایک شاہی بستی بسائی اور اس میں شان دار محل تعمیر کئے۔ ان تعمیرات کے آخری دنوں میں سلطان اتنا مشغول رہا کہ مسلسل تین جمعوں میں وہ مسجد نہ پہنچ سکا۔ چوتھے جمعہ کو جب وہ جامع مسجد آیا تو اس کی موجودگی میں قاضی منذر نے جو خطبہ دیا اس میں نام لئے بغیر سلطان پر سخت تنقید کی۔ قاضی منذر نے اسی آیتیں پڑھیں جن میں دنیا میں عمارتیں کھڑی کرنے اور آخرت سے غافل ہو جانے پر وعیدیں تھیں۔ مثلاً: کیا تم ہر ہندی پر عبت یادگاریں تعمیر کرتے ہو اور شان دار محل بناتے ہو گویا کہ تم کو ہمیشہ اسی دنیا میں رہنا ہے۔ اور جب تم کسی پر حملہ کرتے ہو تو جبارانہ حملہ کرتے ہو۔ پس اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو (مشواری) تمہارا کیا خیال ہے کہ بہتر انسان وہ ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد خدا کے خوف اور اس کی رضا کی طلب پر رکھی ہو یا وہ جس نے اپنی عمارت ایک وادی کی کوکھ کی بے ثبات گھر پر اٹھائی اور وہ اس کو لے کر جہنم کی آگ میں جاگری۔ ایسے ظالم لوگوں کو اللہ کبھی سیدھی راہ نہیں دکھاتا۔ یہ عمارت جو انھوں نے بنائی ہے، ہمیشہ ان کے دلوں میں بے یقینی کی جڑ بنی رہے گی یہاں تک کہ ان کے دل ٹوٹے ٹوٹے ہو جائیں۔ اور اللہ علیم و حکیم ہے (توبہ) اسی طرح قاضی منذر نے اس مضمون کی بہت سی حدیثیں سنائیں اور ان کی تشریح کی۔ اپنے خطبہ میں اگرچہ انھوں نے سلطان کا نام نہیں لیا مگر مسجد کا ہر نمازی سمجھ رہا تھا کہ ان سخت تنقیدوں کا مخاطب کون ہے اور وہ کس کے اوپر پڑ رہی ہیں۔

تنقیدیوں بھی آدمی کے اوپر بہت سخت ہوتی ہے اور جب مجمع عام میں کسی پر تنقید کی جائے تو وہ اور بھی زیادہ ناگوار کی باعث ہوتی ہے۔ مزید یہ کہ یہ تنقید ایک ماتحت کی زبان سے اپنے حاکم کے اوپر تھی۔ اور جب کوئی حاکم اپنے ماتحت کو تنقید کرتے ہوئے سنتا ہے تو اس پر کبر کا سخت دورہ پڑتا ہے۔ بڑے بڑے شریف اور دین دار لوگ بھی اس وقت قابو سے باہر ہوجاتے ہیں۔ مگر سلطان نے مدد درجہ ضبط سے کام لیا۔ اگرچہ

سلطان پر اس تنقید کا بہت زیادہ اثر تھا مگر وہ مسجد میں کچھ نہ بولا اور نماز کے بعد خاموشی سے اٹھ کر باہر آ گیا۔

گھر پہنچ کر سلطان نے اپنے لڑکے الحکم سے کہا کہ آج قاضی منذر نے مجھ کو بہت تکلیف دی۔ اب میں نے طے کر لیا ہے کہ ان کے پیچھے جمعہ کی نماز کبھی نہیں پڑھوں گا۔ الحکم نے کہا: قاضی منذر کا امام ہونا یا نہ ہونا آپ کے اختیار میں ہے۔ آپ ان کو معزول کر دیجئے اور ان کی جگہ دوسرا کوئی امام مقرر کر دیجئے جو ایسی گستاخی نہ کرے۔ یہ سن کر سلطان غصہ میں آ گیا۔ اس نے اپنے لڑکے کو ڈانٹ کر کہا: تمہارا بڑا ہوا، ایک شخص جو ہدایت سے دور ہے اور راستہ سے بھٹکا ہوا ہے کیا اس کی خوشی کی خاطر قاضی منذر جیسے خوبیوں والے آدمی کو معزول کر دیا جائے گا۔ یہ بات کبھی نہیں ہو سکتی (ہذا امالا یسکتون) مجھے ان کی باتوں سے چوٹ لگی اس لئے میں نے ان کے پیچھے جمعہ نہ پڑھنے کی قسم کھالی۔ میری خواہش ہے کہ اس قسم کے کفارہ کی کوئی صورت نکل آئے۔ تاہم قاضی منذر ہماری زندگی میں اور اپنی زندگی میں لوگوں کو نماز پڑھاتے رہیں گے (دل بھلی بالناس حیاتنا و حیاتہ انشاء اللہ تعالیٰ) چنانچہ قاضی منذر بدستور جمعہ کی نماز پڑھتے رہے۔ عبدالرحمن الناصر کے انتقال کے بعد اس کے لڑکے نے بھی ان کے مقام کو اسی طرح باقی رکھا۔

سلطان عبدالرحمن الناصر کے زمانہ میں ایک بار قحط پڑا۔ بہت سخت حالات پیدا ہو گئے۔ سلطان نے اپنا ایک خاص آدمی قاضی منذر بن سعید کے پاس بھیجا اور درخواست کی کہ آپ استقار کی نماز پڑھائیں اور دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے بارش برسائے۔ قاضی منذر نے سلطان کے قاصد سے پوچھا کہ سلطان نے میرے پاس دعا کا پیغام بھیجا ہے مگر وہ خود کیا کر رہے ہیں۔ قاصد نے کہا: آج سے زیادہ ہم نے کبھی ان کو اللہ سے ڈرنے والا نہیں پایا۔ ان کا حال یہ ہے کہ وہ حیران و پریشان ہیں۔ تنہائی میں پڑے ہوئے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ وہ مٹی کے فرش پر نماز پڑھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ وہ اپنے گناہوں کا اعتراف کر رہے تھے اور اللہ سے کہہ رہے تھے: خدایا میری پیشانی تیرے ہاتھ میں ہے کیا تو میرے گناہوں کی وجہ سے لوگوں کو عذاب دے گا حالانکہ تو سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے (ہذا نا صیتی بیدت، اتراث تعذب بنی الرعبۃ و انت رحم الراحمین)

یہ سن کر قاضی منذر کے چہرے پر اطمینان ظاہر ہو گیا۔ انھوں نے قاصد سے کہا: اپنے ساتھ بارش لے کر واپس جاؤ۔ اب ضرور بارش ہوگی۔ کیوں کہ زمین کا حاکم جب قصر ع کرتا ہے تو آسمان کا حاکم ضرور رحم فرماتا ہے (اذا خشع جبار الارض فقد رحم جبار السماء) چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ قاصد واپس ہو کر گھر پہنچا تھا کہ بارش شروع ہو گئی۔

امکان ختم نہیں ہوتا

عبدالرحمن بن معاویہ ابن ہشام (۱۷۲-۱۱۳ھ) بنو امیہ کا ایک شہزادہ تھا۔ وہ نہایت ذہین اور باصلاحیت تھا۔ چنانچہ اس کی تربیت ابتدا ہی سے نہایت شایانہ انداز میں کی گئی۔ اس کو اس طرح تیار کیا گیا کہ جب وہ بڑا ہو تو کامیابی کے ساتھ تخت خلافت پر بیٹھ سکے۔

مگر ۱۳۲ھ میں بنو امیہ کی خلافت ختم ہو کر بنو عباس کی خلافت شروع ہو گئی۔ اس وقت عبدالرحمن کی عمر تقریباً ۲۰ سال تھی۔ جب عباسی لشکر شام میں داخل ہو کر دمشق پر قابض ہو گیا اور بنو امیہ کا قتل عام ہونے لگا اس وقت اتفاق سے عبدالرحمن دمشق میں موجود نہ تھا۔ بلکہ باہر دریائے فرات کے کنارے ایک گاؤں میں گیا ہوا تھا۔ یہاں دریائے کنارے اس کی جاگیر تھی اور اس کے باغات وغیرہ تھے۔ اس وقت وہ یہیں پر مشغول تھا۔

عبدالرحمن کو جب معلوم ہوا کہ بنو امیہ کے افراد کا قتل عام ہو رہا ہے تو وہ یہاں درختوں کے جھنڈ میں خیمہ لگا کر چھپ گیا۔ ایک روز وہ اپنے خیمہ میں تھا کہ اس کا چار سال کا لڑکا خوف زدہ حالت میں خیمہ میں آیا۔ معلوم ہوا کہ بنو عباس کے سپاہی اس کو تلاش کرتے ہوئے اس باغ تک پہنچ گئے ہیں۔ عبدالرحمن نے اپنے بچہ کو گود میں اٹھایا اور دریائی طرف بھاگا۔ وہ دریا میں کود پڑا اور تیرتا ہوا اس کے دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔

عبدالرحمن بن معاویہ دمشق سے بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔ تاہم کئی سال تک اس کی زندگی نہایت مصیبت کی زندگی رہی۔ دشمن سے بچنے کے لیے دریا میں کودنا، جنگلوں میں پناہ لینا، بھوکے پیلے سے ایک علاقے سے دوسرے علاقہ کی طرف بھاگنا، یہ اس کی زندگی تھی۔ اسی حال میں وہ سبط پہونچا۔ جو افریقہ کے ساحل پر واقع تھا۔

بظاہر عبدالرحمن کا مستقبل تاریک ہو چکا تھا۔ اس کی زندگی بنتے بنتے بگڑ گئی تھی۔ بچپن کی عمر میں جس کا یہ حال تھا کہ تخت خلافت اس کا انتظار کر رہا تھا۔ جوانی کی عمر کو پہونچ کر اس کے لیے زمین میں ایک گوشہ بھی نہیں رہا جہاں وہ سکون کی زندگی گزار سکے۔

مگر یابوسی کی آخری حد پر پہنچ کر اس کے لیے امید کی روشنی پیدا ہو گئی۔ عین اسی زمانہ میں اندلس کے مسلمان بے سردار ہو کر آپس میں لڑ رہے تھے۔ دمشق کے مرکز خلافت سے دور ہونے کی وجہ سے یہ حال تھا کہ دمشق اور قرطبہ کے درمیان ایک پیغام کے آنے جلنے میں اکثر مہینوں لگ جلتے تھے۔ اس بنا پر اندلس کے اوپر دمشق کی مضبوط گرفت باقی نہیں رہی تھی۔

اندلس کے یہ حالات عبدالرحمن بن معاویہ کے لیے ایڈوانٹج بن گئے۔ وہ آبنائے جبرالٹر کو پار کر کے اندلس پہنچا۔ وہاں کے مسلمانوں کو ایک سردار کی ضرورت تھی۔ عبدالرحمن اپنی شخصی قابلیت نیز بنو امیہ کا ولی عہد ہونے کی وجہ سے بہت جلد وہاں کے لوگوں کا مرجع بن گیا اور بالآخر اس نے اندلس میں مضبوط مسلم سلطنت قائم کی۔ یہی امیر عبدالرحمن اندلس کی ملی اور تہذیبی ترقیوں کا بانی ہے۔ وہ شخص جس کی تاریخ دمشق میں ختم ہو چکی تھی اس نے اپنی حوصلہ مندی کی بنا پر قرطبہ میں اپنی ایک نئی شاندار تاریخ بتالی۔

حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں کبھی کسی کے لیے امکان ختم نہیں ہوتا۔ جہاں ایک موقع ختم ہو وہیں دوسرا زیادہ بہتر موقع اس کے لیے موجود رہتا ہے۔ جب ایک تاریخ اختتام پر پہنچتی ہے تو وہیں دوسری تاریخ کے آغاز کے امکانات شروع ہو جاتے ہیں۔

مگر نئے امکانات کبھی اپنے آپ واقعہ نہیں بنتے۔ ان کو استغما کر کے انھیں واقعہ بنانے کے لیے ایک حوصلہ مند انسان کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر آدمی اپنی ہمت نہ کھوئے، اگر وہ نئی جدوجہد کی ضروری شرطیں پوری کرنے کے لیے تیار ہو تو اس کے لیے ناکامی کا سوال نہیں۔ یہ دنیا خدا نے اسی لیے بنائی ہے کہ آدمی یہاں جدوجہد کر کے کامیاب ہو۔ اب جو شخص ناکام ہوتا ہے وہ اپنی نادانیوں سے ناکام ہوتا ہے، وہ خود اپنی کوتاہیوں کی سزا بھگتا ہے۔

”انسان کے لیے کبھی امکان ختم نہیں ہوتا“ یہ جملہ اتنا ہی بامعنی ہے جتنا یہ کہنا کہ ”اس دنیا میں کبھی صبح کا آنا بند نہیں ہوتا“ جس طرح ہر رات کے بعد صبح کا آنا یقینی ہے اسی طرح ہر ناکامی کے بعد دوبارہ کامیابی کا دور آنا یقینی ہے۔ تاہم رات کے بعد نئی صبح لانے کے لیے زمین و آسمان کو عظیم گروہش کرنی پڑتی ہے۔ اسی طرح کسی آدمی کی زندگی میں ناکامی کے بعد کامیابی اس وقت آتی ہے جب کہ وہ اس کی خاطر عظیم جدوجہد کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔

اسلامی حکمران

صلاح الدین ایوبی (۱۱۹۳-۱۱۳۸) مصری سلطان کی فوج میں معمولی سپاہی تھے۔ اپنے غیر معمولی کارناموں کی وجہ سے وہ ۳۱ سال کی عمر میں مصری افواج کے سپہ سالار مقرر کیے گئے۔ اسی کے ساتھ انھیں مصر کا وزیر بھی بنا دیا گیا اور انھیں ملک کا خطاب دیا گیا۔ بعد کو ایک انقلاب کے نتیجے میں وہ مصر کے خود مختار سلطان ہو گئے۔

یہ وہ وقت تھا جب کہ طویل صلیبی جنگوں کے درمیان یورپ کی مسیحی طاقتوں نے یروشلم (فلسطین) پر قبضہ کر لیا تھا۔ صلاح الدین ایوبی نے مسلم حکمرانوں میں یہ تبلیغ کی کہ وہ اپنی متحدہ کوشش ہی سے مسیحی یلغار کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ مصر، شام وغیرہ ممالک کو متحد کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

سلطان صلاح الدین ایوبی نے پوری قوم میں جہادی روح پیدا کر دی۔ انھوں نے زبردست تیاری کے بعد جولائی ۱۱۸۷ء میں حطین (فلسطین) کے مقام پر مسیحی افواج پر حملہ کیا اور ان کو فیصلہ کن شکست دی۔ اس کے بعد سلطان صلاح الدین کی فوجوں نے تیزی سے آگے بڑھنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ وہ یروشلم تک پہنچ گئیں اور بالآخر یروشلم کو فتح کر کے فلسطین کو دوبارہ اسلامی خلافت کا حصہ بنا دیا۔

تاہم سلطان صلاح الدین کی فوجی کارروائی نمایاں طور پر مسیحی اقوام کی کارروائیوں سے مختلف تھی۔ مسیحی اقوام نے فلسطین پر قبضہ کرنے کے بعد نہایت وحشیانہ انداز میں مسلمانوں کا قتل عام کیا تھا۔ اس کے برعکس سلطان صلاح الدین ایوبی نے مکمل ضبط سے کام لیا۔ انھوں نے کسی قسم کی انتقامی کارروائی نہیں کی۔ اس سلسلہ میں انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مفت انگار نے اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

Saladin's crowning achievement and the most disastrous blow to the whole crusading movement came on October 2, 1187, when Jerusalem, holy to both Muslim and Christian alike, surrendered to the Sultan's army after 88 years in the hands of the Franks. In stark contrast to the city's conquest by the Christians, when blood flowed freely during the barbaric slaughter of its inhabitants, the Muslim reconquest was marked by the civilized good faith and courteous behaviour of Saladin and his troops.

Encyclopaedia Britannica, 1984 Volume 16, p. 177

صلاح الدین کی شاندار کامیابی اور پوری صلیبی تحریک کی سب سے زیادہ تباہ کن شکست ۲ اکتوبر ۱۱۸۷ء کو ظہور میں آئی جب کہ یروشلم، جو کہ مسلمانوں اور عیسائیوں دونوں کے نزدیک مقدس ہے، وہ ۸۸ برس تک مسیحیوں کے قبضہ میں رہنے کے بعد دوبارہ سلطان کی فوجوں کے قبضہ میں آگیا۔ مسیحیوں نے جب شہر پر قبضہ کیا تھا تو انھوں نے وحشیانہ طور پر اس کے باشندوں کو قتل کیا اور آزادانہ طور پر لوگوں کا خون بہایا۔ اس کے برعکس مسلمانوں کا دوبارہ قبضہ مہذب انسانوں کا قبضہ تھا، صلاح الدین اور اس کی فوجوں نے مفتوح کے ساتھ فیاضانہ برتاؤ کیا۔

رعایا کے ساتھ سلطان صلاح الدین ایوبی کا یہ انصاف محض اتفاقی نہ تھا۔ یہ اس کی اسلامیت کا نتیجہ تھا۔ صلاح الدین صرف ایک بہادر اور حوصلہ مندرشہ سوار ہی نہ تھا۔ وہ ایک خدا ترس اور عبادت گزار آدمی تھا۔ اس کا ذہن اسلامی تعلیمات کے تحت بنا تھا۔

اسلامی تعلیمات کے اثر سے سلطان صلاح الدین کا یہ جال تھا کہ وہ دنیا سے زیادہ آخرت کو اہمیت دیتا تھا۔ وہ اس بات سے ڈرتا تھا کہ قیامت میں اس سے اس کی رعایا کے بارہ میں پوچھ ہوگی۔ اسلام اس کے لیے اس میں ماننے بن گیا تھا کہ اس کے اندر گمنام کا مزاج پیدا ہو۔ اس کے برعکس اس کے اندر زہد اور تواضع کا مزاج تھا۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴ء) کے مقالہ نگار نے سلطان صلاح الدین کے زہد و تقویٰ کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے :

and on March 4, 1193, he died. While his relatives were already scrambling for pieces of the empire, his friends found that the most powerful and most generous ruler in the Muslim world had not left enough money to pay for his grave. (16/178)

اور ۴ مارچ ۱۱۹۳ء کو صلاح الدین کا انتقال ہو گیا۔ جب کہ اس کے رشتہ دار ابھی سلطنت کے ٹکڑوں کے لیے آپس میں کش مکش کر رہے تھے، اس کے دوستوں نے پایا کہ مسلم دنیا کے سب سے زیادہ طاقت ور اور سب سے زیادہ فیاض حکمران نے اپنے پیچھے اتنی رقم بھی نہیں چھوڑی ہے جو اس کی قبر کے اخراجات کو پورا کر سکے۔

اسلام ایک طرف انسان کی صلاحیتوں کو ترقی دیتا ہے۔ اور دوسری طرف اس کو اس سے روکتا ہے کہ وہ اپنی طاقت کے استعمال میں مدے تجاوز کرنے لگے۔

اختلاف کے باوجود

اموی خاندان کے ایک نوجوان عبدالرحمن نے ۵۶، ۶۰ میں اسپین میں بنو امیہ کی سلطنت کی بنیاد رکھی، اس کا دار السلطنت قرطبہ تھا۔ اسی خاندان میں ایک سلطان الحکم گزرا ہے۔ اس نے ۹۶۱ء سے لے کر ۹۷۶ء تک اسپین میں حکومت کی۔

الحکم کو مسلم اسپین کا سب سے بڑا حکمران کہا جاتا ہے۔ مورخ ابن اثیر نے اس کی بابت یہ الفاظ لکھے ہیں: کان محباً لاهل العلم، عالماً، فقیہاً فی المذاہب، عالماً بالانساب والتواریخ، جتباعاً للکتاب والعلماء (وہ اہل علم کو دوست رکھتا تھا۔ عالم اور فقیہ تھا۔ انساب اور تاریخ کا ماہر تھا۔ کتابوں اور علماء کو اپنے پاس جمع رکھتا تھا) الکامل فی التاریخ ۶۷۷/۸

الحکم کی علم پسندی نے اس کو اہل علم کا بے حد قدر داں بنا دیا تھا۔ وہ اہل علم کو نہایت عزت اور احترام کا درجہ دیتا تھا۔ حتیٰ کہ ایک عالم اگر اس کی ذات پر تنقید کرے یا اس کی مرضی کا لحاظ نہ کرے تب بھی اس کی قدر دانی میں کمی نہیں آتی تھی۔ اپنے تمام تر جاہ و جلال کے باوجود وہ اہل علم کے آگے جھک جاتا تھا۔ اس کا ایک واقعہ اس طرح بیان کیا گیا ہے:

الحکم کے زمانہ میں ایک عالم تھے جن کا نام ابوالبراہیم تھا۔ ایک روز وہ قرطبہ کی مسجد ابو عثمان میں وعظ بیان کر رہے تھے۔ عین اس وقت سلطان کا ایک قاصد مسجد میں داخل ہوا۔ اس نے کہا کہ اے ابوالبراہیم، امیر المومنین باہر آپ کے انتظار میں ہیں۔ اور آپ کو اسی وقت بلایا ہے۔ ابوالبراہیم نے بے پردائی کے ساتھ اس شخص کو جواب دیتے ہوئے کہا کہ تم جا کر امیر المومنین سے کہہ دو کہ ابوالبراہیم اس وقت اللہ کے کام میں مصروف ہے۔ وہ جب تک اس کام سے فارغ نہ ہو جائے، آپ کے پاس نہیں آسکتا۔

الحکم کے قاصد کو یہ جواب سن کر حیرانی ہوئی۔ وہ سلطان کی طرف واپس گیا اور ڈرتے ڈرتے اس کو ابوالبراہیم کا جواب سنایا۔ قاصد کی توقع کے خلاف، الحکم نے اس کا کوئی بُرا اثر نہیں لیا۔ اور کسی خشکی کے بغیر کہا کہ تم جا کر ابوالبراہیم سے میرا یہ پیغام کہہ دو کہ ان کی اس

بات کو سن کر مجھے خوشی ہوئی ہے کہ وہ اللہ کے کام میں مصروف ہیں۔ جب ان کو اس کام سے فراغت ہو جائے تو اس وقت وہ میرے پاس آجائیں۔ میں دربار میں ان کا انتظار کروں گا۔ شاہی قاصد نے دوبارہ مسجد میں آکر ابو ابراہیم کو احکم کا پیغام سنایا۔ ابو ابراہیم نے کہا کہ تم جا کر امیر المومنین سے کہہ دو کہ میں بڑھاپے کی وجہ سے اس قابل نہیں کہ پیدل چل کر ان کے پاس آؤں یا گھوڑے کی سواری کروں۔ باب السدہ جو کھلا ہوا ہے وہ یہاں سے کافی دور ہے۔ باب الصنع قریب ہے مگر وہ بند رہتا ہے۔ اگر امیر المومنین باب الصنع کھولنے کی اجازت دے دیں تو میں اس دروازہ سے ان کے پاس آ جاؤں گا۔

باب الصنع ایک مخصوص دروازہ تھا جو ہمیشہ بند رہتا تھا۔ کسی ہنگامی موقع پر ہی اس کو کھولنے کی اجازت ہوتی تھی۔ ابو ابراہیم مذکورہ پیغام دے کر اپنے وعظ میں مصروف ہو گئے۔ دوسری طرف مذکورہ قاصد احکم کے پاس گیا اور اس کو ابو ابراہیم کا پیغام پہنچایا۔ احکم نے قاصد سے کہا کہ تم جا کر مسجد میں بیٹھ جاؤ اور جب وہ اپنا وعظ ختم کر لیں تو ان کو باب الصنع کے راستہ سے گزار کر میرے پاس لے آؤ۔ چنانچہ قاصد واپس آکر مسجد میں بیٹھا رہا۔ ابو ابراہیم نے جب اپنا وعظ ختم کیا تو اس نے ان سے کہا کہ باب الصنع آپ کے لیے کھول دیا گیا ہے اور امیر المومنین آپ کے منتظر ہیں۔ اس کے بعد ابو ابراہیم مسجد سے نکلے اور چلتے ہوئے باب الصنع پر پہنچے۔ وہاں امراء اور درباریوں کی بڑی تعداد ان کے استقبال کے لیے موجود تھی۔ ابو ابراہیم دربار کے اندر داخل ہوئے۔ احکم نے کچھ دیر تک ان سے باتیں کیں۔ اس کے بعد وہ اسی باب الصنع سے عزت و احترام کے ساتھ واپس ہو گئے۔

دور اول میں جو اسلامی انقلاب آیا۔ اس کی نمایاں خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس نے لوگوں میں اکابر پرستی کے بجائے خدا پرستی پیدا کر دی۔ اس نے لوگوں میں یہ مزاج بنایا کہ وہ چیزوں کو شخصیتوں کی نسبت سے دیکھنے کے بجائے حقیقتوں کی نسبت سے دیکھیں۔ یہ فکری انقلاب اتنا طاقتور تھا کہ بعد کو جب مسلمانوں میں خلفاء کے بجائے سلاطین ہونے لگے اس وقت بھی لوگ ملوک اور سلاطین پر کھلی تنقیدیں کرتے تھے اور کسی کو بھی اس پر ٹوکنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔

پکار کے وقت

تھیوفیلس (Theophilus) بازنطینی سلطنت کے آخری دور کا حکمران ہے۔ اس کا مرکز سلطنت قسطنطنیہ تھا۔ اس کا زمانہ حکومت ۸۲۹ء تا ۸۴۲ء ہے۔ تھیوفیلس عباسی خلیفہ المعتمد کا ہم عصر تھا۔ دورِ اول کے مسلمانوں نے قدیم رومی (بازنطینی) سلطنت کے بڑے حصہ کو پہلی صدی ہجری میں فتح کر لیا تھا۔ تاہم قسطنطنیہ اب بھی بازنطینی حکمران کے قبضہ میں تھا۔ موجودہ ترکی کے ایک حصہ پر اب بھی اس کی حکومت قائم تھی۔

قسطنطنیہ کا بازنطینی بادشاہ تھیوفیلس ۲۲۳ھ (۸۳۸ء) میں ایک بڑا لشکر لے کر نکلا اور مسلم علاقہ میں پہنچ کر زبطہ پر چھا پ مارا۔ اسی کے ساتھ اس نے ملطیہ کے مسلم قلعہ پر حملہ کیا۔ ان حملوں میں اس نے بہت سے مسلمان مردوں اور عورتوں کو قتل کیا۔ انھیں گرفتار کیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے کچھ لوگوں کا منہ کیا۔ اس موقع پر ایک واقعہ یہ پیش آیا کہ بازنطینی سپاہیوں نے ایک عربی عورت کو پکڑا اور اس کو گھسیٹے ہوئے لے چلے۔ عورت چلا آئی۔ اس کی زبان سے نکلا: وامتصماہ (ہائے معتمد)

خلیفہ المعتمد اس وقت بغداد میں تھا۔ وہاں سے آنے والوں نے خلیفہ کو بازنطینی حکمران کے منہ الم کی خبریں بتائیں۔ اسی کے ساتھ مذکورہ عرب عورت کا قصہ بھی بتایا۔ المعتمد اس کو سن کر تڑپ اٹھا۔ اس وقت وہ اپنے تخت پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے وامتصماہ کا لفظ سنا تو اس وقت لبیک لبیک کہتے ہوئے تخت سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اپنے محل کی چیت پر چڑھا اور پکار کر کہا: النغیر، النغیر (کوچ، کوچ)

اس کے بعد المعتمد نے زبردست تیاری کی اور ایک طاقتور فوج کو لے کر مقامِ حادثہ کی طرف روانہ ہوا۔ یہاں تک کہ وہ عموریہ (Amorium) پہنچ گیا۔ عموریہ (ترکی) اس وقت بازنطینیوں کے قبضہ میں تھا اور یہاں ان کا قلعہ تھا۔ المعتمد نے قلعہ کو گھیر لیا اور حکم دیا کہ مہینے کے ذریعہ اس پر گولے برسائے جائیں۔ یہاں تک کہ اس کی دیواریں ٹوٹ گئیں۔ المعتمد اپنی فوج کو لے کر قلعہ کے اندر داخل ہو گیا۔ اہل قلعہ نے ہتھیار ڈال دیئے۔ المعتمد نے تمام مسلم قیدیوں کو چھڑایا اور اس عرب عورت کو بھی قید سے رہا کیا جس نے اس سے پہلے وامتصماہ کہہ کر خلیفہ کو پکارا تھا۔

مظلوم کی پکار پر دوڑنا زندہ انسان کی خاص علامت ہے۔ ایک شخص جس کے اندر انسانی جوہر موجود ہو۔ جو اپنے مردانہ اوصاف پر قائم ہو، وہ ایسی کسی پکار کو نظر انداز کرنے کا تحمل نہیں کر سکتا۔ یہی وہ انسانی صفت ہے جس کے بارے میں عرب شاعر نے کہا ہے کہ ان کا بجائی جب اپنی کسی مصیبت پر انہیں پکارے تو اس وقت وہ تفصیل نہیں پوچھتے، وہ فوراً اس کی مدد پر دوڑ پڑتے ہیں :

لا یسئلون اِخاهم حین ینذبہم فی النساہات علی ما قال برہانا
مظلوم کی مدد کرنا یا مظلوم کی پکار پر دوڑنا ایک فطری صفت ہے۔ جن لوگوں کی فطرت زندہ ہو، ان کے اندر یہ انسانی خصوصیت بھی ضرور زندہ ہوگی۔ یہ ناممکن ہے کہ کوئی شخص اپنی فطرت کے اعتبار سے زندہ ہو اور اس کے اندر یہ صفت نہ پائی جائے۔

قومی تعصب یا ذاتی تعلق کے تحت ہر آدمی اپنے لوگوں کی مدد کے لیے دوڑتا ہے۔ مگر اس قسم کے دوڑنے کو کوئی اعلیٰ اخلاقی صفت نہیں کہا جاسکتا۔ اعلیٰ اخلاقی صفت کا درجہ صرف اس دوڑنے کو حاصل ہے جو ذاتی تعلق یا قومی تعصب جیسی چیزوں سے بلند ہو۔ جب کہ آدمی اس لیے دوڑ پڑے کہ پکارنے والا مظلوم ہے، نہ اس لیے کہ ذاتی مفاد یا جماعتی حمیت کا تقاضا ہے کہ اس کی پکار پر دوڑا جائے۔

مومن ایک با اصول انسان ہوتا ہے۔ دوسرے لوگ مفاد کے لیے تڑپتے ہیں، مومن اصول کے تڑپتا ہے۔ دوسرے لوگ اپنی ذات کے لیے عمل کرتے ہیں، مومن اپنے سوا دوسروں کے لیے عمل کرتا ہے۔ عام آدمی اس وقت حرکت میں آتا ہے جب کہ اس کی اپنی ذات کے لیے کوئی مسئلہ پیدا ہو۔ جب کہ مومن کو صرف یہ بات متحرک کر دینے کے لیے کافی ہے کہ انسانی اصولوں میں سے کوئی اصول ٹوٹ گیا ہے۔

المعظم کے جس واقعہ کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، اس کا حوالہ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں مختصر طور پر موجود ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ تھیوفیلس کو ایک (IX/939, 3/559)

خونی جنگ میں جولائی ۸۲۸ میں شکست ہوئی :

Theophilus was defeated in a bloody battle at Dazmana in July 838.

اسلامی شجاعت

حطین کی جنگ (۱۱۸۷ء) تاریخ کی مشہور جنگ ہے۔ حطین شمالی فلسطین کا ایک مقام ہے۔ صلاح الدین ایوبی نے اسی مقام پر اپنی غیر معمولی جنگی منصوبہ بندی کے ذریعہ صلیبی فوجوں پر فتح حاصل کی۔ اس وقت مسلم فوج کی تعداد ۱۸ ہزار تھی، اور عیسائی فوج کی تعداد ۱۵ ہزار۔ جنگ میں بیشتر عیسائی فوجی مارے گئے۔ اور مسلمانوں کو فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی۔

جنگ کے بعد بہت سے عیسائی سردار گرفتار ہوئے۔ ان میں یروشلم کا بادشاہ (Guy de Lusignan) اور فرانسسی جنرل ریمینالڈ (Reginald) بھی شامل تھا۔ ریمینالڈ کے متعلق مورخین متفق ہیں کہ اس نے صلاح الدین ایوبی کے ساتھ بار بار غدر کا معاملہ کیا تھا۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۳ء) نے لکھا ہے کہ ریمینالڈ ۱۱۴۷ء اور ۱۱۸۷ء کے درمیان ہونے والی صلیبی لڑائیوں میں اہم فوجی شخصیتوں میں سے ایک تھا جس کی صلح کی مدت کے دوران مسلم قاتلوں پر ناعاقبت اندیشانہ حملوں کی پالیسی آخر کار یروشلم کی لاطینی بادشاہت کی بربادی اور اس کے بیشتر علاقوں کے کھوئے جانے کا سبب بنی :

One of the leading military figures of the Crusades between 1147 and 1187, whose reckless policy in raiding Muslim caravans during periods of truce led to the virtual destruction of the Latin Kingdom of Jerusalem and the loss of most of its territory (VIII/480).

مورخ ابن شداد نے لکھا ہے کہ ریمینالڈ نے ایک بار مسلم قافلہ پر دھوکے سے حملہ کیا۔ انہوں نے اس کو خدا کا واسطہ دلایا۔ اور اس معاہدہ صلح کا واسطہ دیا جو اس کے اور مسلمانوں کے درمیان ہوا تھا۔ مگر ریمینالڈ نے کہا کہ اپنے محمد سے کہو۔ وہ تمہیں بچائے۔ یہ خبر جب صلاح الدین ایوبی تک پہنچی تو اس نے نذر مانی کہ اللہ جب اس کے اوپر مجھے فتح دے گا تو میں خود اس کو قتل کروں گا (انہما ہذا ہذربا القافلۃ ناشدوا اللہ والصلح الذی بینہ و بین المسلمین۔ فقال : قولوا الحمد لکم یخلصکم۔ فلما بلغ ذلک عنہ نذر انہ متی اظفرہ اللہ بہ قتله بنفسہ، صفحہ ۱۲۷)

جنگ کے بعد ریحنا لڈ اور دوسرے لوگ قیدی کی صورت میں صلاح الدین ایوبی کے سامنے لائے گئے۔ صلاح الدین نے ریحنا لڈ کی غداری کے واقعات اس کو یاد دلائے۔ نیز اس واقعہ کو یاد دلایا جب کہ اس نے حاجیوں کے ایک قافلہ کو لوٹا تھا۔ اور ان کی فریاد پر ان سے کہا تھا کہ اپنے محمد کو بلاؤ، وہ تم کو بچائیں گے۔ اس کے بعد صلاح الدین نے تلوار اپنے میان سے نکالی اور ریحنا لڈ کی گردن مار دی۔ اس کو قتل کرتے ہوئے صلاح الدین نے کہا کہ لو یہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے تمہارا انتقام لیتا ہوں (ھا انا ذا انتصر لمحمد صلی اللہ علیہ وسلم)

یہ دشلم کے بادشاہ گائی نے جب ریحنا لڈ کا یہ انجام دیکھا تو وہ کانپ اٹھا۔ وہ ڈرا کہ اب میرا بھی یہی انجام ہوگا۔ اس کو یقین ہو گیا کہ تلوار کا دوسرا وار اس کے اوپر پڑنے والا ہے۔ مگر سلطان صلاح الدین نے اس کو یہ کہہ کر مطمئن کر دیا :

لیس من عادة الملوك ان يقتلوا الملوك
ولما هذا فانه نفق العهد مرة بعد مرة
نحبري ما فحبري (الواد السلطانيہ، ۲۴۰)

یہ بادشاہوں کی عادت نہیں کہ وہ بادشاہوں کو قتل کریں۔ باقی اس شخص (ریحنا لڈ) نے تو عہد کو بار بار توڑا تھا۔ پس ہوا جو کچھ ہوا۔

سلطان صلاح الدین ایوبی نے اس شخص کو قتل کر دیا جس نے بار بار کے غدر اور معاہدہ کی خلاف ورزی سے یہ ثابت کیا تھا کہ وہ ناف بل معافی حد تک ایک برا آدمی ہے۔ مگر صلاح الدین نے اس شخص کو چھوڑ دیا جو اگرچہ دشمن تھا۔ مگر اس نے خبت اور کمینگی اور نفقہ عہد کا کوئی مظاہرہ نہیں کیا تھا۔

اسی کا نام اسلامی شجاعت ہے۔ سچا اسلامی بہادر وہ ہے جو لڑنے کے ساتھ صلح بھی کرنا جانتا ہو۔ جو انتقام لینے کے ساتھ معاف کرنے کا حوصلہ بھی رکھتا ہو۔ جو یہ جانتا ہو کہ کب تلوار اٹھانی جاتی ہے اور کب یہ ضروری ہوتا ہے کہ تلوار کو میان میں ڈال لیا جائے۔

مومن کی صفات میں سے ایک صفت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ حد کے اندر رہتا ہے۔ کسی سے خوش ہو تب بھی وہ ایک حد کے اندر رہ کر خوشی کا اظہار کرے گا۔ وہ اگر کسی سے غصہ ہو جائے تب بھی اس کا غصہ اس کو حد سے باہر کرنے والا ثابت نہیں ہوگا۔ مومن کی یہ صفت اس کو قابل پیشین گوئی کردار کا حامل بنا دیتی ہے۔

تاریخ کا صفحہ

اسپین میں تقریباً ۸۰۰ سال تک مسلمانوں کی حکومت قائم رہی۔ ۱۴۹۲ء میں اس حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ خاتمہ کے وقت بھی مسلمان اپنے حریف اسپینیوں کے مقابلہ میں ہر اعتبار سے زیادہ ترقی یافتہ تھے۔ مسیحیوں کی فتح اور مسلمانوں کی شکست کا بنیادی سبب یہ تھا کہ مسیحیوں نے متحد ہو کر اپنی طاقت بہت زیادہ بڑھائی اور مسلمانوں نے آپس کے اختلاف کی وجہ سے اپنے آپ کو بے مدد کمزور کر لیا۔

مسلم دور حکومت میں بھی اسپین کا ایک نسبتاً چھوٹا حصہ مسیحیوں کے پاس تھا۔ اس کو اپنا سیاسی مرکز بنا کر وہ مسلم حکومت کے خلاف کارروائی کرتے رہتے تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کے باہمی اختلاف سے فائدہ اٹھا کر آخری دور میں اپنا رقبہ کافی بڑھالیا تھا اور مسلمانوں کے پاس صرف غرناطہ (Granada) رہ گیا تھا۔

دور آخر کا ایک مسلم حکمران سلطان ابوالحسن تھا، مسیحی حکمران فردی نند (Ferdinand II) نے سلطان سے مطالبہ کیا کہ وہ اس کو خراج دینا منظور کرے۔ سلطان ابوالحسن نہایت بہادر تھا۔ اس نے فردی نند کو جواب میں لکھا کہ ”غرناطہ کے دارالضرب میں اب سونے کے سکوں کے بجائے فولادی تلواریں تیار کی جا رہی ہیں تاکہ مسیحیوں کی گردنیں ماری جائیں“ اس کے بعد دونوں کے درمیان کئی مسلح تصادم ہوئے۔ آخر کار ۱۴۹۲ء میں گوشہ کے مقام پر دونوں کے درمیان زبردست جنگ ہوئی۔ اس میں فردی نند کی فوجوں کو مکمل شکست اور سلطان ابوالحسن کی فوجوں کو مکمل فتح حاصل ہوئی۔

اس کے بعد فردی نند نے از سر نو اپنے کو تیار کرنا شروع کیا۔ اس وقت مسیحی اسپین میں دو حکومتیں تھیں۔ ایک اراغون (Aragon) جہاں فردی نند کی حکومت تھی۔ دوسرا قسطلہ (Castile) جہاں ملکہ ازابیلا (Isabella I) تخت کی مالک تھی، فردی نند نے یہ دانش مندی کی کہ ازابیلا کو راضی کر کے ۱۴۶۹ء میں اس سے نکاح کر لیا۔ اس طرح دونوں کو ملا کر ایک بڑی مسیحی سلطنت وجود میں آگئی۔

ایک طرف مسیحی دنیا میں یہ اتحادی واقعہ ہوا۔ دوسری طرف یہ اختلافی واقعہ پیش آیا کہ سلطان ابوالحسن کے لڑکے ابو عبد اللہ محمد نے اپنے باپ کے خلاف بغاوت کر دی، وہ سلطنت غرناطہ کے ایک حصہ پر قبضہ کر کے بیٹھ گیا۔ اب سلطان ابوالحسن کی حکومت صرف چار ہزار مربع میل پر مشتمل ہو کر رہ گئی۔ دوسری طرف فردی نند کی سلطنت کا رقبہ بڑھ کر سو الاکھ مربع میل ہو گیا۔ اس صدمہ کے بعد

سلطان ابو الحسن پر فالج کا حملہ ہوا اور اس کی بینائی بھی ختم ہو گئی۔

سلطان ابو الحسن اس کے بعد غرناطہ کے تخت سے دستبردار ہو گیا اور اپنی جگہ اپنے بھائی ابو عبد اللہ زغل کو سلطان مقرر کیا۔ اس کے بعد ایک سازش کے تحت ابو عبد اللہ زغل کو سلطنت سے ہٹا دیا گیا اور ابو عبد اللہ محمد پورے سلطنت غرناطہ کا حکمراں بن گیا۔ مگر اس کے اندر اپنے باپ والی دانش مندی موجود نہ تھی چند مقابلوں میں اس نے مسیحی حکمراں سے شکست کھائی۔

آخری مرحلہ میں غرناطہ کے قلعہ کو مسیحی فوجوں نے گھیر لیا۔ ابو عبد اللہ محمد جس نے اپنے اور اپنے بچپا کے مقابلہ میں بہادری دکھائی تھی وہ مسیحی فوجوں کے مقابلہ میں صرف بزدل ثابت ہوا۔ آخر کار ۲ جنوری ۱۴۹۲ء کو اس نے قلعہ اور غرناطہ کی دستبرداری کے معاہدہ پر دستخط کر دیے۔ اس معاہدہ پر ایک طرف فاتح فردی نند نے اپنا دستخط ثبت کیا۔ اور دوسری طرف مفتوح ابو عبد اللہ محمد نے۔

ایک مورخ نے اسپین کے مذکورہ واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ غرناطہ کے آخری مسلم حکمراں سلطان ابو الحسن نے فردی نند اور ازبیل کو شکست دی تھی۔ مگر اس کے اپنے لڑکے ابو عبد اللہ نے اس کے خلاف بغاوت کر دی جو آخر کار اس کے باپ کے زوال کا سبب بنی۔

The last ruler of Granada, Sultan Abul-Hasan, defeated Ferdinand II (1452-1516) and Queen Isabella, but his own son, Abu Abdullah, made a coup against his father which resulted to the downfall of his father.

اس دنیا میں باہمی اتحاد سب سے بڑی طاقت ہے اور باہمی اختلاف سب سے بڑی کمزوری۔ یہ بلاشبہ تاریخ کا سب سے بڑا سبق ہے۔

اختلاف کا سبب کیا ہوتا ہے اور اتحاد کس طرح پیدا ہوتا ہے۔ اس کا سادہ سا جواب یہ ہے کہ جب لوگوں کے اوپر ذاتی مفاد کا غلبہ ہو جائے تو ان کے درمیان اختلاف ابھرائے گا۔ اور جب وہ قومی مفاد کو اہمیت دیں تو وہ باہم متحد رہیں گے۔ قوم کے وسیع تر مفاد کا احساس انفرادی اختلافات پر غالب آجاتا ہے۔ لوگ اختلاف کے باوجود متحد رہتے ہیں۔ لوگ اختلاف کے باوجود اپنے اپنے اختلاف کو اپنی ذات تک رکھتے ہیں، وہ اپنے اختلاف کو اجتماعی تعلق میں موثر نہیں ہونے دیتے۔

ماضی اور حال

ہارون الرشید (۸۰۹-۷۶۶ء) عباسی دور کا مشہور خلیفہ ہے۔ اس کی حکومت مشرق میں چین سے لے کر مغرب میں اٹلانٹک تک پھیلی ہوئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ ہارون الرشید نے بادل کے ایک ٹکڑے کو ہوا میں اڑتے ہوئے دیکھا تو اس کی زبان سے نکلا: امطری حیث شئت فسیا تبی خراجا حب (جہاں چاہے جا کر برس، تیرا خراج میرے ہی پاس آئے گا)

خلیفہ ہارون الرشید کے زمانہ میں بغداد دنیا کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ شہر تھا۔ اس نے فرانس کے بادشاہ شارلیمان (۸۱۴-۷۷۲ء) کے لیے ایک گھڑی بطور تحفہ بھیجی تھی۔ یہ گھڑی پانی سے چلتی تھی اور وقت بتانے کے لیے آواز کرتی تھی۔ اس کو دیکھ کر شارلیمان کے درباری حیران رہ گئے۔ وہ اس کی تشریح نہ کر سکے۔ انھوں نے گمان کیا کہ اس گھڑی کے اندر ایک شیطان ہے جو اس کو حرکت دیتا ہے (اھدی لشارلمان ساعة مائیة دقاقة۔ اختار رجال شارلمان فی تفسیرھا وظنوا ان فیھا شیطانا یحرکھا)

خلیفہ ہارون الرشید کے زمانہ کا ایک واقعہ عرب تاریخوں میں نقل کیا گیا ہے، اس زمانہ میں نفغور اول (NICEPHORUS I) روم کی باقی ماندہ سلطنت کا جانشین تھا۔ اس نے ارادہ کیا کہ اس کی حکومت عباسی خلافت کو جو خراج دے رہی تھی، اس کو روک دے۔ اس نے ہارون الرشید کو ایک خط لکھا۔ اس کا مضمون یہ تھا:

من نفغور ملك الروم الى هارون ملك العرب۔	شاہ روم نفغور کی طرف سے شاہ عرب ہارون کے نام
اما بعد فإن السلطنة التي كانت قبلي اقامتک	اس کے بعد یہ ہے کہ مجھ سے پہلے جو ملکہ تھی اس نے تم کو
مقام الرخ و اقامت نفسها مقام البیذق۔	رخ (خیالی قسم کا بڑا جانور) کی حیثیت دے دی اور
فحملت الیک اموالها احمالا۔ وذلك	اپنے آپ کو بیذق (شطنخ کپیادہ) سمجھ لیا۔ چنانچہ
لضعف النساء وحمقهن۔ فاذا قرأت	اپنا مال لا در کہتمہارے پاس بھیج دیا۔ یہ عورتوں کی
کتابی فاردم ما حصل قبلك	کمزوری اور ان کی بے وقوفی کی وجہ سے ہوا پس
من اموالها والاف السیف	جب تم میرے اس کو پڑھو تو اس کا جو مال تم کو اس

بیزنٹائن (تاریخ الخلفاء للسیوطی، ۲۶) سے پہلے پہنچا اس کو مجھے لوٹا دو۔ ورنہ ہمارے اور تمہارے درمیان تلوار ہے۔

ہارون الرشید نے جب اس خط کو پڑھا تو وہ سخت غضب ناک ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے مسلم دوات منگوائی۔ اور اسی خط کی پشت پر اپنے قلم سے یہ الفاظ لکھ کر بھیج دیے کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم، ہارون امیر المؤمنین کی طرف سے رومی کتے نقفور کے نام، ۱۰۷ کافر عورت کے بچے، میں نے تمہارا خط پڑھ لیا۔ اس کا جواب تم جلد ہی دیکھ لو گے (۲۶۸)

اس جواب کو بھیجنے کے فوراً بعد خلیفہ نے تیاری کا حکم دے دیا۔ اور سپر ایک طاقتور فوج لے کر تیزی سے رومی علاقہ کی طرف روانہ ہوا۔ اس نے نقفور سے کئی لڑائیاں لڑ کر اس کو بری طرح شکست دی۔ یہاں تک کہ وہ مجبور ہو گیا کہ دوبارہ بغداد کو خراج دینے پر راضی ہو جائے۔

نقفور سے پہلے ملکہ آئرین (Irene) رومی تخت کی وارث تھی۔ ۸۰۲ میں ایک انقلاب ہوا اور ملکہ آئرین کی حکومت ختم ہو گئی۔ نقفور ۸۱۱ تک حکمران رہا :

When Nicephorus withheld the tribute that Irene had agreed to pay the Baghdad caliph Harun ar-Rashid, was followed, and Arab forces defeated the Byzantine emperor at Crasus in Phrygia (805). In 806 Harun captured Heraclea, Tyana, and other places. Nicephorous was forced to agree to pay a yearly tribute of 30,000 gold pieces. (EB-VII/322)

جب نقفور نے اس خراج کو روک دیا جس کو ملکہ آئرین نے بغداد کے خلیفہ ہارون الرشید کو دینا منظور کیا تھا تو دونوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ عرب فوجوں نے بازنطینی بادشاہ کو ۸۰۵ میں کراس کے مقام پر شکست دی۔ ۸۰۶ میں ہارون نے ایشیائے کوچک پر ایک لاکھ ۲۵ ہزار سے زیادہ لشکر کے ساتھ حملہ کیا اور ہرقل اور تیاز اور دوسرے مقامات پر قبضہ کر لیا۔ نقفور کو اس پر مجبور کر دیا گیا کہ وہ بغداد کو سالانہ ۳۰ ہزار سونے کا مسکہ ادا کرے۔

دور اول کے مسلمانوں کی طاقت کا راز صرف تلوار نہ تھی۔ ان کی طاقت کا اصل راز یہ تھا کہ وہ علم میں دوسری قوموں سے حیران کن حد تک آگے بڑھے ہوئے تھے۔ علم ہی کے ذریعہ آدمی حقیقتوں سے واقف ہوتا ہے۔ علم ہی کے ذریعہ یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ اعلیٰ درجہ کی منصوبہ بندی کر سکے۔ علم اس دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے۔

رحم دل فاتح

۲ اکتوبر ۱۱۸۷ء مسلم تاریخ کا نہایت اہم دن ہے۔ یہی وہ دن ہے جب کہ صلیبی طاقتوں کے ۸ سالہ قبضہ کے بعد سلطان صلاح الدین ایوبی دوبارہ بیت المقدس میں داخل ہوئے۔

۱۰۹۵ء میں پوپ نے یورپی قوموں کو صلیبی جنگ پر ابھارا تاکہ ”مسیح کی مقدس قبر کو مسلمانوں کے ہاتھ سے واپس لیا جاسکے“ اس کے جواب میں یورپ کے مسیحی حکمران جوش کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ مسیحیوں اور مسلمانوں کے درمیان ہولناک لڑائیاں ہوئیں۔ یہاں تک کہ مسیحیوں نے فلسطین کے بڑے حصہ پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد فتح کے نشہ میں انھوں نے تمام انسانی قدروں کو پامال کر ڈالا۔ وہ مسلمانوں کو فلسطین سے بزور زکا لے گئے اور انھیں ہلاک کرنا شروع کیا۔

اس موضوع پر بہت سی کتابیں مختلف زبانوں میں چھپ چکی ہیں۔ حال میں ریاض کے عربی ماہنامہ الفیصل (ربیع الآخر ۱۴۰۹ھ) میں اس کے بارہ میں ایک مفید معلوماتی مضمون شائع ہوا ہے۔ یہ مضمون فرانسیسی مشرق آلاں روکو کے فرانسیسی مقالہ کا ترجمہ ہے جو مصطفیٰ کمال البابری نے کیا ہے۔

صلاح الدین ایوبی ۲۷ نومبر ۱۱۷۴ء کو دمشق پہنچے۔ پھر وہ حلب گئے۔ جلد ہی اپنی خصوصیات کی بنا پر انھیں دمشق، حلب، قناہرہ کے حاکم کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ انھوں نے دمشق کو اپنا دار الحکومت بنایا۔ خلیفہ بغداد نے ان کو مصر اور شام کا فرماں روا تسلیم کر لیا۔ اپنی صفات کی بنا پر وہ عامۃ الناس کے محبوب بن گئے۔ ان کو سیف الاسلام کہا جانے لگا۔

صلاح الدین نے اس کے بعد اپنی فوج کو طاقتور انداز میں منظم کیا۔ اور پھر انھوں نے صلیبیوں کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا جو فلسطین پر قبضہ کیے ہوئے تھے۔ انھوں نے عہد کیا کہ وہ ارض مقدس سے صلیبی طاقتوں کو نکال کر رہیں گے۔ اعلیٰ ترین جنگی منصوبہ ثابت کرتا ہے کہ صلاح الدین جنگی امور میں عمق و مہارت رکھتے تھے (خطة حربية عالية المستوى تدل على عبقرية صلاح الدين العسكرية) انھوں نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ صلیبی فوجوں کو پانی سے محروم کر دیا اور حطین کے مقام پر ان کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔

صلاح الدین نے مسلسل فتوحات حاصل کرتے ہوئے اکتوبر ۱۱۸۷ء میں قلعۃ القدس پر قبضہ کر لیا۔ صلیبیوں نے اپنے زمانہ اقتدار میں فلسطین کے مسلمانوں پر ہر قسم کے ظلم کیے تھے۔ مگر صلاح الدین نے فتح حاصل کرنے کے بعد ان کے خلاف کوئی بھی انتقامی کارروائی نہیں کی۔ ان کی تلوار صلیبی جارحیت کے خلاف میان سے نکلی تھی، صلیبی جارحیت کو ختم کرتے ہی وہ دوبارہ میان میں چل گئی۔

فرانسیسی مشرق نے لکھا ہے کہ صلاح الدین نے مسیحیوں کے ساتھ انتہائی شریفانہ معاملہ کیا۔ قدس میں داخل ہونے کے بعد انھوں نے حکم جاری کیا کہ اسپتالوں میں جو مسیحی لوگ زیر علاج ہیں، ان کا علاج جاری رکھا جائے۔ تمام بڑے بڑے چرچ مسیحیوں کے قبضہ میں بدستور باقی رہے۔ انھوں نے ۱۵۰۰ مسیحیوں کے اوپر سے جزیہ معاف کر دیا، کیوں کہ انھوں نے کہا تھا کہ وہ مغربی کی وجہ سے جزیہ نہیں دے سکتے۔ انھوں نے ایک بڑے صلیبی عہدیدار کو اجازت دی کہ وہ چرچ کے خزانہ کو اپنے ساتھ جہاں چاہے لے جائے۔ وغیرہ

صلیبی فوجی جو گرفتار ہو گئے تھے، ان کی عورتیں صلاح الدین کے پاس آئیں۔ انھوں نے صلاح الدین کے پیروں پر اپنا سر رکھ دیا اور اپنے فوجی شوہروں کی رہائی کی درخواست کی۔ چنانچہ انھوں نے تمام فوجیوں کی رہائی کا حکم دے دیا۔ مضمون ان الفاظ پر ختم ہوتا ہے :

فقه کان المورخ الفرشی (جوستاف لوبون) فرانسیسی مورخ گستاخ لیسان یہ کہنے میں بالکل علی حق عندما قال جملة الماثورة : حق بجانب تھا کہ تاریخ نے عربوں سے زیادہ لم يعرف التاريخ فاتحاً ارحم مد رحم دل فاتح نہیں دیکھا العرب (صفحہ ۱۰۱)

جنگ کے بارہ میں یہی اسلام کا اصول ہے۔ اسلام جارحیت کے خلاف دفاع کی مکمل اجازت دیتا ہے۔ مگر جب جارح کی تلوار ٹوٹ جائے تو اس کے بعد اہل اسلام بھی اپنی تلوار توڑ لیتے ہیں۔ اسلام میں دفاع ہے مگر جارحیت نہیں۔ اسلام میں حفاظتی کارروائی ہے مگر انتقامی کارروائی نہیں۔ اسلام میں اپنا حق وصول کرنا ہے مگر اسلام میں یہ جائز نہیں کہ آدمی دوسرے کے خلاف دست درازی کرنے لگے۔ اسلام جس دل میں اترتا ہے وہ اس کو مثبت احساسات میں جینے والا انسان بناتا ہے نہ کہ منفی احساسات میں جینے والا انسان۔

ظالم کا دل ہل گیا

ساتویں صدی ہجری میں تاتاری قبائل نے اسلامی سلطنت پر حملہ کیا اور عراق، ایران، ترکستان میں مسلم تہذیب و سلطنت کو زیر و زبر کر ڈالا۔ مگر اس کے بعد اللہ نے ان کے دلوں کو نرم کیا اور غریباً پوری کی پوری قوم مسلمان ہو کر اسلام کی پاسبان بن گئی۔ اس زمانہ کے دعوتی واقعات میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ شیخ جمال الدین ایرانی کہیں جا رہے تھے۔ اتفاق سے انھیں دنوں ایک تاتاری شہزادہ تفلک تیمور شکار کے لئے نکلا ہوا تھا۔ یہ شہزادہ تاتاریوں کی چغتائی شاخ کا ولی عہد تھا جو ایران پر حکومت کر رہی تھی۔ شیخ جمال الدین ایرانی چلتے ہوئے اس علاقہ میں پہنچ گئے جہاں شہزادہ شکار کھیل رہا تھا۔ تاتاری اس زمانہ میں ایرانیوں کو محسوس سمجھتے تھے۔ شہزادہ کے سپاہیوں نے شکار گاہ میں ایک ایرانی کی موجودگی کو برا خیال سمجھا اور ان کو پکڑ لیا۔ اس کے بعد وہ اس گستاخ ایرانی کو شہزادہ کے پاس لے گئے۔ شہزادہ ان کو دیکھ کر سخت برہم ہوا۔ غصہ کی حالت میں اس کی زبان سے نکلا: تم ایرانیوں سے تو ایک کتا اچھا ہے۔ شیخ جمال الدین تاتاری کے اس نفرت انگیز سوال کو سن کر سنجیدہ انداز میں بولے: اگر تم کو سچا دین نہ ملا ہوتا تو یقیناً ہم کتے سے بھی زیادہ برے ہوتے۔

تاتاری اگرچہ وحشی تھے مگر ان میں فطری مردانگی کا جو ہر موجود تھا۔ وہ منافقت سے خالی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ شیخ کا یہ جواب تفلک تیمور کے لئے سخت جھنجھوڑنے والا ثابت ہوا۔ اس نے حکم دیا کہ جب میں شکار سے فارغ ہو جاؤں تو اس ایرانی کو میری خدمت میں حاضر کرو۔ شیخ جمال الدین جب حاضر کئے گئے تو وہ ان کو تنہائی میں لے گیا اور ان سے پوچھا کہ یہ دین کیا ہے۔ شیخ جمال الدین نے نڈر ہو کر اس کے سامنے اسلام کی تعلیمات پیش کیں۔ اس گفتگو نے تاتاری شہزادہ کا دل ہلادیا۔ بے دینی کی حالت میں مرنے والے بڑا خطرناک معلوم ہونے لگا۔ وہ اس پر آمادہ ہو گیا کہ اسلام قبول کرے۔ تاہم ابھی وہ ولی عہد تھا، بادشاہ نہ تھا۔ اس نے کہا کہ اس وقت اگر میں اسلام قبول کرتا ہوں تو میں اپنی رعایا کو اسلام کے دین پر نہیں لاسکتا۔ اس نے شیخ جمال الدین سے کہا: اچھا اس وقت تم جاؤ۔ جب تم سنو کہ میری تاج پوشی ہوئی ہے اور میں تخت پر بیٹھ گیا ہوں تو اس وقت تم میرے پاس آنا۔

شیخ جمال الدین اپنے گھر واپس آ گئے اور اس وقت کا انتظار کرنے لگے جب کہ تفلک تیمور کی تخت نشینی کی خبر انھیں معلوم ہو۔ مگر یہ وقت ان کی زندگی میں نہیں آیا۔ یہاں تک کہ وہ مرض الموت میں مبتلا ہو گئے۔ اس وقت انھوں نے اپنے لڑکے شیخ رشید الدین کو بلایا اور تاتاری شہزادہ کا قصہ بتا کر کہا کہ دیکھو میں ایک مبارک گھڑی کا انتظار کر رہا تھا۔ مگر اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا آنا میری زندگی میں مفید نہیں۔ اس لئے میں تم کو وصیت کرتا ہوں کہ جب تم سنو کہ تفلک تیمور کی تاج پوشی ہوئی ہے تو تم وہاں جانا اور اس کو میرا سلام کہنا

اور بے خوفی کے ساتھ اس کو شکار کا واقعہ یاد دلانا جو میرے ساتھ پیش آیا تھا۔ شاید اللہ اس کا سینہ حق کے لئے کھول دے۔

اس کے بعد شیخ جمال الدین کا انتقال ہو گیا۔ باپ کی وصیت کے مطابق ان کے لڑکے شیخ رشید الدین تاتاری شہزادہ کی تخت نشینی کا انتظار کرنے لگے۔ جلد ہی ان کو خبر ملی کہ تعلق تیمور تخت پر بیٹھ گیا ہے۔ اب وہ اپنے وطن سے روانہ ہوئے۔ منزل پر پہنچے تو درباروں نے خیمہ کے اندر جانے سے روک دیا۔ کیوں کہ ان کے پاس درباروں کو بتانے کے لئے کوئی بات نہ تھی کہ وہ کیوں بادشاہ سے ملنا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے یہ کیا کہ خیمہ کے قریب ایک درخت کے نیچے پڑاؤ ڈال کر ٹھہر گئے۔

ایک روز وہ فجر کے لئے اٹھے۔ اول وقت تھا اور فضا میں ابھی سناٹا چھایا ہوا تھا۔ انھوں نے بلند آواز سے اذان دینا شروع کیا۔ یہ آواز خیمہ کے اس حصہ تک پہنچ گئی جہاں شاہ تعلق تیمور سو رہا تھا۔ بادشاہ کو ایسے وقت میں یہ آواز بے معنی شور معلوم ہوئی۔ اس نے اپنے ملازموں سے کہا کہ دیکھو یہ کون پاگل ہے جو اس وقت ہمارے خیمہ کے پاس شور کر رہا ہے۔ اس کو پکڑ کر ہمارے پاس حاضر کرو۔ چنانچہ شیخ رشید الدین فوراً بادشاہ کی خدمت میں حاضر کر دئے گئے۔

اب بادشاہ نے ان سے سوال وجواب شروع کیا کہ تم کون ہو اور کیوں ہمارے خیمہ کے پاس شور کر رہے ہو۔ شیخ رشید الدین نے اپنے والد شیخ جمال الدین کی پوری کہانی سنائی اور کہا کہ آپ کے سوال کے جواب میں جب میرے والد نے کہا تھا کہ اگر ہم کو سچا دین نہ ملا ہو تا تو یقیناً ہم کتے سے بھی زیادہ برے ہوتے تو آپ نے کہا تھا کہ اس وقت میں کچھ نہیں کہتا مگر جب میری تخت نشینی ہو جائے تو تم میرے پاس آنا۔ مگر اس کے انتظار میں میرے والد کا آخری وقت آ گیا۔ اب ان کی وصیت کے مطابق میں آپ کے پاس وہ بات یاد دلانے کے لئے حاضر ہوا ہوں۔

بادشاہ نے پورے قصہ کو غور کے ساتھ سنا۔ آخر میں بولا کہ مجھے اپنا وعدہ یاد ہے۔ میں تمہارے انتظار میں تھا۔ اس کے بعد اس نے اپنے وزیر کو بلوایا اور کہا کہ ایک راز میرے سینہ میں تھا جس کو آج اس ایرانی فیکر نے یاد دلایا ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ میں اسلام قبول کر لوں۔ تمہاری کیا رائے ہے۔ وزیر نے کہا کہ میں بھی یہی راز اپنے سینہ میں لئے ہوئے ہوں۔ میں سمجھ چکا ہوں کہ سچا دین یہی ہے۔ اس کے بعد بادشاہ اور وزیر دونوں شیخ رشید الدین کے ہاتھ پر مسلمان ہو گئے۔ اس کے بعد لقیہ درباریوں نے بھی اسلام قبول کر لیا۔ بادشاہ کے قبول اسلام کے بعد پہلے ہی دن ایسا لالہ سا ٹھہرا آدمیوں نے اسلام قبول کر لیا اور بالآخر ایران کی پوری تاتاری قوم نے بھی۔

تاریخ کا ایک صفحہ

چودھویں صدی عیسوی میں دو بڑے مسلم حکمران تھے۔ ایک تیمور لنگ (۱۳۰۵-۱۳۳۶) اور دوسرا بایزید اول (۱۳۰۲-۱۳۸۹) تیمور لنگ سمرقند (وسط ایشیا) میں پیدا ہوا۔ وہ چنگیز خاں کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ بایزید اول اناطولیہ (ترکی) میں پیدا ہوا۔ اس کا دار السلطنت ایڈریانوپل تھا۔

ان دونوں مسلم حکمرانوں کے درمیان ایک نہایت ہولناک جنگ ہوئی جس کو تاریخ میں جنگ انگورہ (Battle of Angora) کہا جاتا ہے۔ انگورہ موجودہ انقرہ کا انگریزی نام ہے۔ تیمور نے چاہا کہ وہ بایزید کی سلطنت کے ایشیائی علاقہ پر قبضہ کر لے۔ یہاں سے دونوں میں اختلافات پیدا ہوئے۔ دونوں ایک دوسرے کے خلاف کارروائی کرنے لگے۔ بایزید نے تیمور کے دشمنوں کو اپنے یہاں پناہ دی۔ تیمور نے بایزید کے دشمنوں سے تعلق قائم کیا، وغیرہ۔

اس قسم کی کارروائیاں ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ جولائی ۱۴۰۲ میں انگورہ (انقرہ) کے مقام پر دونوں کی فوجیں ایک دوسرے سے ٹکرائیں۔ دونوں طرف نہایت بہادر لوگ تھے۔ چنانچہ دونوں کے درمیان سخت ہولناک لڑائی ہوئی۔ ایک مورخ کے الفاظ میں گویا دو پہاڑ آپس میں ٹکرائے۔ دونوں طرف کے تقریباً ڈیڑھ لاکھ آدمی مارے گئے۔ آخر کار بایزید کو شکست ہوئی۔ وہ گرفتار ہوا اور اسی حالت میں اس کا انتقال ہو گیا۔

چودھویں صدی عیسوی میں ساری دنیا میں تیمور اور بایزید کے برابر کوئی طاقتور بادشاہ موجود نہ تھا۔ ان دونوں کے درمیان جنگ چھڑی تو عالم یہ تھا کہ دور تک خون اور لاشوں کے سوا اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اس ہولناک جنگ کے سلسلہ میں کچھ لوگ تیمور کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں اور کچھ لوگ بایزید کو۔ تاہم ذمہ دار جو بھی ہو۔ نتیجہ بہر حال ایک تھا۔ وہ یہ کہ اس لڑائی سے عالم اسلام کو شدید ترین نقصان پہنچا۔ یہ کہنا صحیح ہو گا کہ یورپ جو عثمانی ترکوں کے ذریعہ اسلامی براعظم میں جا رہا تھا، وہ اس باہمی جنگ کے نتیجہ میں عیسائی براعظم بن کر رہ گیا۔

جنگ کا فیصلہ ۲۰ جولائی ۱۴۰۲ کو ہوا۔ بایزید گرفتار ہو گیا۔ تیمور نے اس کو ایک نوہے کے

کھڑے میں بند کروایا۔ تیمور اپنے سفروں میں اس کھڑے کو ساتھ ساتھ لے جاتا تھا تاکہ اس کی تشہیر کرے۔ سلطان بایزید اس رسوائی کو برداشت نہ کر سکا۔ گرفتاری کے صرف آٹھ ماہ بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ خود تیمور بھی اپنی فتح کے ڈھائی سال بعد اس دنیا سے رخصت ہو کر وہیں چلا گیا جہاں اس نے اپنے مفتوح سلطان کو پہونچایا تھا۔ دنیا میں بظاہر ایک فاتح تھا اور دوسرا مفتوح۔ مگر آخرت نے دونوں کے فرق کو ختم کر دیا۔ آخرت میں دونوں یکساں طور پر خدا کے بندے کی حیثیت سے خدا کی عدالت میں پیش کر دیئے گئے۔

تیمور اور بایزید دونوں نہایت بہادر تھے۔ تیمور کی ہیبت مشرقی دنیا پر چھائی ہوئی تھی اور بایزید کی ہیبت مغربی دنیا پر جس نے اسلام کے حدود دریائے ڈینیوب (ہنگری) تک پہونچا دیئے تھے۔

اگر ایسا ہوتا کہ تیمور اپنے محل کا میدان مشرق کو بناتا اور بایزید مغرب کی سمت میں آگے بڑھتا تو وہ دونوں پورے عالم کو اسلام کے سایہ میں لانے کے لیے کافی ہو جاتے۔ مگر آپس کی لڑائی نے اس امکان کو واقعہ بننے نہیں دیا۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مقالہ نگار نے تیمور کے تذکرے کے ذیل میں لکھا ہے :

By defeating the Ottoman Sultan Bayezid at Angora (modern Ankara) in 1402 and thus preventing him from extending his domain into Europe, the fall of Constantinople and the death agony of Byzantium were delayed half a century by this Muslim nomad (18/242).

یعنی تیمور نے عثمانی سلطان بایزید کو انگورہ (موجودہ انقرہ) کے مقام پر ۱۴۰۲ میں شکست دی۔ اس طرح اس نے بایزید کو یورپ میں اپنا اقتدار بڑھانے سے روک دیا۔ اس کے نتیجہ میں قسطنطنیہ کی فتح اور بازنطینی سلطنت کا خاتمہ نصف صدی تک کے لیے موخر ہو گیا۔

مسلمان اکثر دوسری قوموں کی شکایت کرتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کو جتنے بھی نقصان پہونچے ہیں، سب اپنوں کی وجہ سے پہونچے ہیں۔ مسلمانوں کی آپس کی لڑائیاں مسلمانوں کی بربادی کا سب سے بڑا سبب ہیں، گزرے ہوئے دور میں بھی اور حال کے زمانہ میں بھی۔ مگر تاریخ کا یہی سب سے بڑا سبق ہے جس سے مسلمانوں نے کوئی سبق نہیں سیکھا۔

ترک فاتح

ترکوں نے ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ فتح کیا جو اب استانبول کہا جاتا ہے۔ یہ مسیحی دنیا کے لیے سب سے زیادہ ہلادینے واقعہ تھا۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ ایک یونانی کتبہ میں اس کے بارے میں یہ الفاظ لکھے گئے کہ اس سے زیادہ ہولناک واقعہ نہ کبھی ہوا اور نہ کبھی ہوگا :

There has never been and there never will be
a more dreadful happening (p. 336).

حضرت عثمان کی خلافت (۶۵۶-۶۴۴ء) کے زمانہ میں مسلمان ترکی میں داخل ہو گئے تھے۔ امیر معاویہ کے زمانہ میں انہوں نے ترک علاقہ میں مزید پیش قدمی کی۔ مگر اس کا دار السلطنت قسطنطنیہ انتہائی محفوظ جغرافیہ اور بے حد مضبوط قلعہ کی بنا پر اتنا محکم تھا کہ بار بار کوشش کے باوجود مسلمان اس کو مسخر نہ کر سکے۔ اس کی تسخیر ۸۰۰ سال بعد صرف ۱۴۵۳ء میں ممکن ہو سکی۔

ترکی کا عثمانی سلطان محمد دوم جو محمد فاتح کے نام سے مشہور ہے، وہ پہلا شخص ہے جس نے اس طویل ہم کو کامیابی تک پہنچایا۔ اس نے اس مقصد کے لیے نہایت گہرا منصوبہ بنایا۔ سلطان محمد ۱۴۵۱ء میں تخت پر بیٹھا جو اس وقت ادرنہ (Edirne) میں تھا۔ اس نے خاموش اور مسلسل عمل کے ذریعہ تمام ممکن سیاسی اور فوجی تدبیریں اس مقصد کے لیے مہیا کیں۔

۱۴۵۲ء کا پورا سال اس نے باغورس کے کنارے ایک نیا قلعہ تعمیر کرنے میں صرف کیا جہاں سے جنگی کارروائیوں کو منظم کیا جاسکے۔ یہ قلعہ بعد کو قلعہ رومیل (Rameli Hisari) کے نام سے مشہور ہوا۔ اس نے جنگی جہازوں کا ایک طاقتور بیڑا تیار کر دیا تاکہ سمندر کے راستے سے موثر حملہ کیا جاسکے۔ اس نے ہنگری کے ایک استاد اربان (Urban) کو بلا کر اتنی بڑی توپ تیار کرائی جو اس وقت کے یورپ میں ایک نادر چیز تھی۔ یہ توپ سازی بے مداحم تھی، کیونکہ اسی کے ذریعہ قسطنطنیہ کی مضبوط سنگی فصیل توڑی جاسکی۔

اس قسم کی مختلف ضروری تیاریوں کے علاوہ اس نے مزید یہ کیا کہ بوقت جنگ یونان اور ہنگری کو غیر جانب دار رکھنے کے لیے ان سے امن معاہدے کیے جن کی شرائط ایک طرف طور پر ان کے مفاد میں تھیں :

To keep Venice and Hungary neutral, he signed peace treaties favourable to them (11/860).

یہ عین وہی تدبیر تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاہدہ حدیبیہ کے وقت اختیار فرمائی، اور جس کے ذریعہ آپ نے مکہ کے قریش کو خیر کے یہودیوں سے کاٹ دیا تھا۔ اس معاہدہ کے تحت قریش اس کے پابند ہو گئے تھے کہ بوقت جنگ وہ یہودی مدد نہیں کریں گے۔

ان تمام تیاریوں کے بعد سلطان محمد خاموش نہیں بیٹھا۔ بلکہ اس نے جنگی کارروائی کی کسان براہ راست اپنے ہاتھ میں لے لی۔ پوری ہم کے دوران وہ بذات خود اس میں شریک رہا۔ قسطنطنیہ کی ہمسامی تیاری اور اس کی کارروائیوں کی تفصیل بہت لمبی ہے۔ اس کو تاریخ کی کتابوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ اس زبردست منصوبہ بندی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ فتح ہو گیا۔ بازنطینی شہنشاہیت کا آخری تاجدار قسطنطین (Constantine XI) جنگ کرتا ہوا شہر کے دروازے پر مارا گیا۔ ترکی میں مسلمانوں کی فتح تکمیل کو پہنچ گئی۔

اس فتح کے بعد ترکی کی راجدھانی ادرنہ (ایڈریانوپل) کے بجائے قسطنطنیہ قرار پائی اور آج تک وہ وہیں قائم ہے۔ اب اس کا نام استانبول ہے۔ قسطنطنیہ گیارہ سو سال سے زیادہ مدت تک مسیحی سلطنت کی راجدھانی تھا۔ اس کے بعد وہ مسلم سلطنت کی راجدھانی بنا۔ تقریباً پانچ سو سال تک وہ عظیم عثمانی خلافت کی راجدھانی اور پورے عالم اسلام کی سیاسی طاقت کا مرکز رہا ہے۔ اس کی یہ حیثیت پہلی بار صرف جنگ عظیم اول (۱۸-۱۹۱۴ء) میں ختم ہوئی۔

فتح مکہ (۶۳۰ء) سے لے کر فتح قسطنطنیہ (۱۴۵۳ء) تک اسلامی تاریخ کے تمام بڑے بڑے فاتحانہ واقعات گہری حکمت اور عظیم منصوبہ بندی کے ذریعہ انجام پائے ہیں۔ یہ صرف موجودہ زمانہ کی بات ہے کہ مسلمان تدبیر اور منصوبہ بندی کے بغیر محض جوش و خروش کے ذریعہ کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہیں، یہی واحد وجہ ہے جس کی بنا پر بالاکوٹ مارچ (۱۸۳۱ء) سے لے کر اجودھیا مارچ (۱۹۸۹ء) تک ان کے تمام اقدامات صرف ناکامی پر ختم ہو رہے ہیں۔

حدیث میں ہے کہ مومن کی فراست سے بچو۔ کیوں کہ وہ خدا کے نور سے دیکھتا ہے مومن کا ایمان اس کو زیادہ بہتر تدبیر کے قابل بنادیتا ہے۔

ناکامیوں کے بعد

نہیر الدین محمد بابر (۱۵۳۰-۱۵۸۳) فرغانہ میں پیدا ہوا۔ یہ علاقہ اس وقت ازبکستان (ازبیک) میں شامل ہے۔ باپ کے واسطے اس کا سلسلہ نسب تیمور سے ملتا ہے اور ماں کے واسطے سے چنگیز خاں سے۔ بابر کا باپ عمر شیخ مرزا فرغانہ کا حاکم تھا۔ اُس وقت یہ مقام کوہ ہندو کش کے شمال میں ایک چھوٹے پرگنہ کی حیثیت رکھتا تھا۔

فرغانہ کے پڑوس میں سمرقند تھا جو تیمور کی قدیم راجدھانی تھا۔ یہاں محمد شیبانی خاں کی حکومت تھی جو چنگیز خاں کی نسل سے تعلق رکھتا تھا۔ بابر کا باپ مستقل اس کوشش میں رہا کہ وہ سمرقند کو فتح کر کے اس کو اپنی سلطنت میں شامل کرے۔ مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ باپ کی وفات پر ۱۴۹۴ء میں بابر فرغانہ کا حاکم بنا جب کہ اس کی عمر صرف گیارہ سال تھی۔ باپ کی پیروی میں اس نے سمرقند پر قبضہ کرنے کے لیے اس پر کئی حملے کیے۔ مگر ۱۵۰۱ء میں اس کو فیصلہ کن شکست ہوئی۔ یہاں تک کہ اس نے خود اپنی موروثی سلطنت فرغانہ کو بھی کھو دیا۔

ایک مورخ نے لکھا ہے کہ ایک کم سن بادشاہ کی حیثیت سے بابر نے فرغانہ کو کھو دیا۔ وہ مصیبتوں کے ایک دور میں داخل ہو گیا۔ اس کو خود اپنے پدمی اور مادری چچاؤں سے لڑائی لڑنی پڑی۔ مگر ۲۰ سالہ مصیبت اور جنگ کے دوران اس نے اپنے حریفوں (ترک، مغل، ایرانی اور افغانی) سے کامیاب جنگی تدبیریں اور حربی طریقے سیکھ لیے۔ اس نے ان طریقوں میں سائنٹفک امتزاج پیدا کیا۔ ساہا سال کی شکستوں اور وطن سے محسوس اور طرح طرح کی مشکلات کے نتیجہ میں وہ ایک اچھا فوجی جنرل بن گیا۔ اپنے باپ دادا کے علاقہ کو حاصل کرنے کے بارہ میں اپنے منصوبہ کی ناکامی کے بعد بابر نے اپنی توجہ ہندستان کی طرف موڑ دی :

As a boy king he lost Farghana and passed through a period of adversity, having to fight his own paternal and maternal uncles. During 20 years of adversity and warfare Babur trained himself by appropriating military tactics and modes of warfare of his adversaries – Turks, Mongols, Persians, and Afghans, and he made a scientific synthesis of these systems. He became a good general through a career of many defeats and through years of homeless wanderings, privations and hardships... Foiled in his design of recovering his ancestral domain in Central Asia, Babur turned his attention to India. (9/378).

بار نے پہلی بار ۱۵۱۹ میں ہندستان پر حملہ کیا۔ اس کی پیش قدمی جاری رہی۔ یہاں تک کہ ۱۵۲۶ میں اس نے دہلی اور آگرہ پر قبضہ کر کے ہندستان میں مغل سلطنت کی بنیاد رکھی۔ اپنے وطن فرغانہ کو اس نے ایک شکست خوردہ انسان کی حیثیت سے چھوڑا تھا، مگر ۲۶ دسمبر ۱۵۳۰ کو آگرہ میں جب اس کا انتقال ہوا تو تاریخ اس کو اپنے صفحات میں ایک فاتح بادشاہ کی حیثیت سے درج کر چکی تھی۔

بار کو کامیابی اس حوصلہ مندانہ عمل کی بنا پر ہوئی کہ اس نے اپنی ناکامی کو کامیابی میں تبدیل کیا۔ اس نے خود ناکامی کے اندر وہ پہلو تلاش کر لیے جو اس کو عظیم تر کامیابی کی طرف لے جانے والے ہوں۔

بار کو جب اپنے حریفوں کے مقابلہ میں شکست ہوئی تو اس نے شکایتی انداز اختیار نہیں کیا۔ اس نے ایسا نہیں کیا کہ وہ ان کی سازشوں اور ان کے تخریبی منصوبوں کی فہرست مرتب کرنے لگے۔ وہ اپنے حریفوں کے خلاف لفظی گولہ باری میں مشغول ہو جائے۔

اس کے بجائے بار نے اپنا ذہن اس سوچ میں لگایا کہ میرے حریفوں کو میرے مقابلہ میں کامیابی کیونکہ حاصل ہوئی۔ میری بار اور ان کی جیت کا سبب کیا تھا۔ بار کی اس سوچ نے اس کو بتایا کہ اس کے حریف زیادہ کارگر تدبیروں کو جانتے تھے۔ انھوں نے زیادہ موثر حربے استعمال کر کے اس کو ناکام بنا دیا۔

اب بار نے اپنے حریف کے حربوں اور ان کی تدبیروں کو اپنا شروع کیا۔ اس نے مزید غور و تجربہ کے ذریعہ ان کو مزید ترقی یافتہ بنایا۔ اس طرح زیادہ بہتر طور پر مسلح ہو کر اس نے ایک نئے وسیع تر میدان (برصغیر ہند) کی طرف رخ کیا۔ اس کی یہ تدبیر کامیاب رہی۔ اپنے وطن میں اس نے جتنا کھویا تھا، اس سے بہت زیادہ اس نے وطن کے باہر حاصل کر لیا۔

موجودہ دنیا مقابلہ کی دنیا ہے۔ یہاں دوسروں سے ٹکراؤ ہوتا ہے۔ اس لیے ناکامیوں کا پیش آننا لازمی ہے۔ کامیاب وہ ہے جو اپنی ناکامی کو اپنے لیے غذا بنا سکے۔ وہ کھونے میں پانے کا راز دریافت کر لے۔

مومن سب سے زیادہ اس پوزیشن میں ہوتا ہے کہ وہ اپنی ناکامی کو کامیابی میں تبدیل کر سکے۔ کیونکہ مومن کا اللہ پر ہر دوسرے اس کو کبھی مایوس اور پست ہمت نہیں ہونے دیتا۔ وہ ہر حال میں پرامید رہتا ہے، کیونکہ ہر حال اس کو یقین ہوتا ہے کہ اس کا خدا اس کو دیکھ رہا ہے۔ اور وہ ہر دوسرے کا ساتھ دے کر اس کو

میدانِ جنگ میں نماز

اورنگ زیب عالمگیر (۱۶۵۷-۱۷۰۷) مشہور مغل حکمران ہے۔ اس کے زمانہ میں مغل سلطنت کو سب سے زیادہ وسعت حاصل ہوئی۔ اس کی زندگی کا تقریباً نصف حصہ لڑائیوں میں گزرا۔ اس کی بہادری کے بہت سے عجیب واقعات تاریخ کی کتابوں میں نقل کیے گئے ہیں۔ اورنگ زیب نوجوانی کی عمر ہی میں اپنی امتیازی صلاحیتوں کی بنا پر شاہی خاندان میں نمایاں ہو گیا تھا۔ جب وہ نوجوان تھا، اس زمانہ میں ایک بار ایسا ہوا کہ ایک مست ہاتھی اس کے سامنے آگیا۔ اس وقت وہ گھوڑے پر سوار تھا۔ پہلے اس نے گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھے ہوئے ہاتھی کا مقابلہ کرنا چاہا۔ لیکن گھوڑا بدکنے لگا۔ اورنگ زیب اس سے ہراساں نہیں ہوا۔ وہ گھوڑے سے اتر پڑا اور زمین پر آکر تلوار کے ذریعہ ہاتھی کا مقابلہ کرنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ اس نے ہاتھی کو زیر کر لیا۔

انہیں صفات کی بنا پر شاہ جہاں اس کی بہت قدر کرتا تھا۔ نوجوانی کی عمر ہی سے اس کو بڑی بڑی مہموں پر بھیجنے لگا تھا۔ اورنگ زیب لڑائی کے گڑے خوب واقف تھا۔ وہ دشمن کا مقابلہ نہایت اطمینان کے ساتھ کرتا تھا اور کبھی گھبراتا نہ تھا۔ منتقل مزاجی کی صفت اس کے اندر کمال درجہ میں تھی۔ ان تمام صفات کے باوجود وہ انتہائی سادہ مزاج تھا اور بالکل معمولی زندگی گزارتا تھا۔

ایک مورخ نے لکھا ہے کہ جزیرہ ماے ہند میں (اورنگ زیب کے زمانہ میں) اگرچہ برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی اپنے کچھ ہولڈنگ رکھتی تھی، مگر کابرٹ کے زمانہ میں اور اس کے بعد تک فرانسیسیوں کی پیش قدمی بہت مست رہی۔ اس کی وجہ جزئی طور پر یہ تھی کہ آخری مغل شہنشاہ اورنگ زیب انڈیا پر حکومت کر رہا تھا اور یہاں غالب تھا :

In the Indian peninsula, where the English East India Company had holdings, French progress was slow in Colbert's time and after, partly because the last great Mughal emperor, Aurangzeb, reigned and dominated India. (4/887)

اورنگ زیب کی زندگی کے واقعات میں سے ایک واقعہ وہ ہے جو ۱۶۴۷ء میں پیش آیا۔ جب کہ اس نے عین میدان کارزار میں گھوڑے سے اتر کر نماز ادا کی۔ ڈاکٹر آرسی جمدار اور ڈاکٹر ایچ سی رائے چودھری نے اپنی مشترک کتاب (An Advanced History of India) میں اس واقعہ کو ان الفاظ میں درج کیا ہے :

Aurangzeb was a pious Muslim, and with the zeal of Puritan he scrupulously observed the injunctions of the Holy Qur'an. Once during the Balkh campaign he knelt down to finish his prayers at the proper time, though the fighting was going on all around him. (p. 501-502)

اورنگ زیب ایک پارہ مسلمان تھا۔ اور ایک سخت محتاط مذہبی انسان کی طرح جو شخص کے ساتھ وہ مقدس قرآن کے احکام کی اطاعت کرتا تھا۔ ایک بار بلخ کے محرمہ کے دوران وہ زمین پر جھک گیا تاکہ ٹھیک وقت پر اپنی نماز کو مکمل کرے۔ اگرچہ اس وقت اس کے چاروں طرف لڑائی جاری تھی۔

جنگ وہ لمحہ ہے جب کہ ہر طرف تیر، تلوار اور نیزوں کی جھنکار ہوتی ہے۔ چاروں طرف قتل اور خون کا بھیاںک منظر دکھائی دیتا ہے۔ زندگی اور موت دونوں اتنے قریب آجاتے ہیں کہ دونوں کے درمیان کوئی فاصلہ باقی نہیں رہتا، اس وقت عین میدان جنگ میں نماز کے لیے کھڑا ہونا اور اطمینان کے ساتھ رکوع اور سجدہ کرنا ایک انتہائی حیرت انگیز واقعہ ہے۔ وہ کونسی طاقت ہے جو ایک انسان کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ اس قسم کا حیرت ناک واقعہ ظہور میں لاسکے۔

یہ اللہ پر ایمان کی طاقت ہے۔ ایک مومن جب نماز میں کھڑا ہوتا ہے تو اس وقت اس کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسی ہستی کی حمایت میں آگیا ہے جو تمام طاقتوں سے زیادہ طاقتور ہے۔ جو ہر خطرہ کے مقابلہ میں اس کی طرف سے ناقابل تسخیر ڈھال بن سکتا ہے۔ یہ احساس مومن کے اندر بے پناہ اعتماد پیدا کر دیتا ہے۔ انسان اس کی نظر سے اوجھل ہو جاتے ہیں اور خدا اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ اس کو اپنے سامنے دکھائی دینے لگتا ہے۔ ایمان ایک عظیم عقیدہ ہے اور اسی کے ساتھ ایک عظیم طاقت بھی۔

حسد کے نقصانات

بہمنی سلطنت ۱۳۴۷ء میں سلطان محمد بن تغلق سے بغاوت کر کے قائم ہوئی۔ اس کا بانی حسن گنگو تھا۔ حسن کا کہنا تھا کہ وہ ایران کے قدیم بادشاہ بہمن کی اولاد سے ہے۔ اس بنا پر اس کا خاندان بہمنی خاندان کہا جاتا ہے۔

حسن گنگو نے گلبرگہ کو اپنی راجدھانی قرار دیا اور اپنی سلطنت کے حدود کو بڑھانا شروع کیا۔ ۱۳۵۹ء میں حسن گنگو کی وفات ہوئی۔ اس کے بعد اس کا جانشین احمد شاہ بہمنی ہوا۔ اس نے شہر بیدربایا اور گلبرگہ کے بجائے بیدر کو اپنی راجدھانی قرار دیا۔

دکن کی یہ بہمنی سلطنت ۱۸۰ سال تک رہی اور ۱۵۲۷ء میں ختم ہو گئی۔ اس سلطنت کا وزیر ۱۴۶۳ء سے لے کر ۱۴۸۱ء تک محمود گواں تھا۔ اس کا زمانہ بہمنی سلطنت کا سب سے زیادہ کامیاب زمانہ ہے۔ اس نے سلطنت کو مزید وسیع کیا اور اپنے تندر سے اس کو نہایت مستحکم کیا۔ مورخین نے بالاتفاق اس کی اعلیٰ یاقوت کا اعتراف کیا ہے۔ ایک مورخ نے لکھا ہے کہ ”محمود گواں تاریخ ہند کے بہترین مدبروں اور منتظموں میں شمار کیا جاتا ہے“۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴ء) کے مقالہ نگار نے اس کی بابت یہ الفاظ لکھے ہیں :

The most notable personality of the period,
a leading administrator (9/372).

(اس عہد کی سب سے زیادہ ممتاز شخصیت، ایک اعلیٰ انتظام کار) این ایڈوانڈ ہسٹری آف انڈیا (۱۹۷۸ء) کے مصنفین نے ان الفاظ میں اس کے اخلاص کا اعتراف کیا ہے :

Though possessed of wide powers, Mahmud Gawan never abused his authority. By virtue of his skilful diplomacy and successful military operations, he brought the dominions of the Bahmanis to an extent never achieved by former sovereigns.

An Advanced History of India (1987) p. 354

اگرچہ محمود گواں کو نہایت وسیع اختیارات حاصل تھے مگر اس نے کبھی اپنے اختیار کا بے جا استعمال نہیں کیا۔ اپنی ماہرانہ سیاست اور اپنے کامیاب فوجی اقدامات کے ذریعہ اس نے بہمنی سلطنت کے

رقبہ کو ایسی حدود تک پہنچایا جو پچھلے حکمرانوں کے زمانہ میں کبھی نہیں پہنچا تھا۔

محمود گواں اس قدر محنت کا عادی تھا کہ وہ اپنا ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرتا۔ اپنی موزرتیں اس نے بہت محدود کر لی تھیں۔ چٹائی پر سوتا، مٹی کے برتن میں کھانا کھاتا اور نہایت سادہ زندگی گزارتا۔ اس کے ذاتی کتب خانہ میں تین ہزار کتابیں تھیں۔ اس نے بہمنی سلطنت کی راجدھانی بیدر میں ایک مدرسہ قائم کیا اور اپنی تمام کتابیں وہاں بھیج دیں۔ مدرسہ کی عمارت کے آثار اب بھی بیدر میں موجود ہیں۔ اس کے زمانہ میں بہمنی سلطنت کو بہت ترقی ہوئی۔

محمود گواں کے زمانہ میں بہمنی تخت پر محمد شاہ سوم تھا۔ یہ بادشاہ نہایت آرام طلب اور ناکارہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت کا سارا انتظام عملاً محمود گواں کے ہاتھ میں آ گیا۔ محمود گواں نے اس اقتدار کا کبھی ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا۔ پھر بھی دربار کے امرار اس کے قوت و اثر کو دیکھ کر اس سے جلنے لگے۔ انھوں نے خفیہ طریقہ سے محمود گواں کی سرکاری مہر حاصل کر لی۔ اس کے بعد ایک جعلی خط اس کی مہر کے ساتھ تیار کیا جو وجہ نگر کے راجہ رائے زسننگہ کے نام لکھا گیا تھا۔ یہ فرضی خط انھوں نے بادشاہ کو دکھایا اور کہا کہ وزیر غدار ہے۔ وہ بادشاہ کو تخت سے بے دخل کرنے کے لیے وجہ نگر کے راجہ کے ساتھ ساز باز کر رہا ہے۔

بادشاہ امیروں کے دھوکے میں آ گیا۔ اس نے ۵ اپریل ۱۴۸۱ء کو اس لائق وزیر کو قتل کر دیا۔ بعد کو بادشاہ کو پتہ چلا کہ اس نے غلطی کی ہے، اس کو بے حد صدمہ ہوا، یہاں تک کہ وہ خود بھی ایک سال کے اندر ۱۲ مارچ ۱۴۸۲ء کو مر گیا۔

محمود گواں کے خلاف اس شرم ناک سازش کا اصل دماغ ملک نائب تھا۔ مگر محمود گواں کے بعد اس کو بھی جین نصیب نہ ہو سکا۔ اب دربار میں اس کے مخالفین پیدا ہو گئے۔ دوبارہ اس کے خلاف بھی سازش ہوئی اور ۱۴۸۶ء میں ملک نائب کو بے دردی کے ساتھ قتل کر دیا گیا۔ مقتول کے خاتمہ کے صرف پانچ سال بعد خود قاتل کا بھی ذلت کے ساتھ خاتمہ ہو گیا۔

محمود گواں کے قتل کے بعد بہمنی سلطنت دوبارہ سنبھل نہ سکی۔ ۱۵۲۴ء میں اس کے آخری حکمران کی وفات کے ساتھ بہمنی سلطنت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اس کے بعد اس علاقہ میں بغاوتیں ہوئیں اور ایک سلطنت پانچ الگ الگ سلطنت میں تقسیم ہو گئی۔

عالی ظرفی

منظف حلیم (متوفی ۹۳۳ھ) گجرات کا حاکم تھا اور محمود غلجی مانڈو (احمد آباد) کا۔ دونوں ہم زمانہ تھے۔ پاس پاس ہونے کی وجہ سے دونوں میں باہم لڑائیاں بھی ہوتی رہتی تھیں۔ محمود غلجی اکثر گجرات پر حملہ کرتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ اس "خوبصورت اور سرسبز" ملک کو اپنی سلطنت میں شامل کرے۔ تاہم اسے اپنے ارادہ میں کامیابی نہ ہو سکی۔ اس درمیان میں ایک واقعہ پیش آیا جو مظفر حلیم کے لئے بہت خوش کن تھا۔ وہ یہ کہ اس کے حریف محمود غلجی کے وزیر منڈلی رائے نے موقع پا کر بغاوت کر دی۔ اس کی بغاوت کامیاب رہی، اس نے سلطان کو تخت سے بے دخل کر دیا اور خود ملک پر قابض ہو گیا۔ تاہم سلطان محمود غلجی اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو گیا۔

اب اس کے سامنے یہ سوال تھا کہ کیا کرے۔ اس کی نظر میں صرف ایک ہی شخص تھا جو اس نازک وقت میں اس کی مدد کر سکتا تھا اور یہ وہی سلطان مظفر حلیم تھا جس کے اوپر وہ اپنے اقتدار کے زمانہ میں بار بار حملے کر چکا تھا۔ سلطان محمود غلجی کو معلوم تھا کہ سلطان مظفر حلیم اگرچہ اس کا حریف ہے مگر وہ ایک بہادر اور شریف انسان ہے۔ اور شریف اور بہادر انسان کی یہ صفت ہے کہ وہ مدد مانگنے والے کی مدد کرتا ہے، خواہ وہ اس کا حریف اور دشمن ہی کیوں نہ ہو۔

سلطان محمود غلجی نے کئی دن کے حیرت میں کے بعد بالآخر فیصلہ کیا کہ وہ سلطان مظفر حلیم کے پاس جائے گا اور اس سے مدد طلب کرے گا۔ وہ جرات کر کے اس کے پاس پہنچا اور اس سے درخواست کی کہ وہ اس کے باغی وزیر کے خلاف اس کی مدد کرے۔

سلطان مظفر حلیم کو موقع تھا کہ وہ اپنے حریف کو ذلیل کرے۔ وہ طعن و تشنیع کر کے اس کے بارے میں اپنے سینہ کو ٹھنڈا کرے۔ مگر اس نے اس قسم کی کوئی بات نہیں کی۔ وہ فوراً اپنے حریف سلطان کی مدد کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔ سلطان مظفر حلیم نے حکم دیا کہ اس کی فوج مانڈو کی طرف کوچ کرنے کے لئے تیار ہو جائے۔ اس نے محمود غلجی کو کیا اور خود اپنی فوج کے ساتھ مانڈو کے لئے روانہ ہوا۔ وہاں پہنچ کر وزیر منڈلی رائے کی فوج سے زبردست مقابلہ ہوا۔ بالآخر منڈلی رائے کی فوج نے ہتھیار ڈال دیے اور گجرات دوبارہ فتح ہو گیا۔

اب فوجیوں کی فاتحانہ نفسیات نے ایک نیا مسئلہ پیدا کر دیا۔ سلطان مظفر حلیم کے فوجی سرداروں نے کہا کہ یہ ملک اب آپ کا ہے۔ کیونکہ اس کو آپ کی فوجوں نے لڑ کر فتح کیا ہے۔ آپ اس کو محمود غلجی کے حوالے نہ کریں بلکہ اس کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کا اعلان کر دیں۔ اس معاملہ میں ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔

سلطان مظفر حلیم کے لئے یہ بہت نازک لمحہ تھا۔ تاہم اس نے جرأت سے کام لیا اور اپنے فوجی سرداروں کے اس مشورہ کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اس کو یہ بات اپنی بہادری اور غیرت کے خلاف معلوم ہوئی کہ جس ملک کو اس نے سلطان محمود غلجی کے نام پر فتح کیا ہے، اس کو سلطان کے حوالے نہ کرے اور خود اس پر قابض ہو جائے۔ سلطان کی جو شرافت اس کی تحریک بنی تھی کہ وہ اپنے دشمن کی مشکل وقت میں مدد کرے، وہی شرافت دوبارہ اس میں مانع ہو گئی کہ وہ دشمن کی کمزوری کا غلط فائدہ اٹھائے اور اس کی چیز کو خود اپنے قبضہ میں لے لے۔ اس کے ایک طرف شرافت تھی اور دوسری طرف ملک۔ اس نے اس سے انکار کر دیا کہ وہ ملک کو پانے کی خاطر اپنی شرافت کو کھودے۔

تاہم سلطان مظفر حلیم کو اندیشہ تھا کہ اس کی فوج اگر مفتوحہ علاقہ میں ٹھہری رہی تو فتح کے جوش میں وہ کوئی نازک مسئلہ نہ کھڑا کر دے اور موجودہ فضا باقی نہ رہے۔ چنانچہ اس نے فوراً ایک حکم جاری کیا۔ اس حکم میں کہا گیا تھا کہ اس کی فوجوں کا کام اب یہاں ختم ہو چکا ہے اس لئے ضروری ہے کہ اس کی فوج کا کوئی شخص مزید آگے بڑھ کر مفتوحہ شہر کے اندر نہ داخل ہو۔ تمام کی تمام فوج بلاتا خیر اپنے وطن کی طرف واپس چلی جائے۔

اس حکم پر فوراً عمل ہوا۔ سلطان مظفر حلیم کی فوج اپنے فتح کئے ہوئے ملک کو سلطان محمود غلجی کے حوالے کر کے مجرات واپس چلی گئی۔ سلطان مظفر حلیم نے ایک مفتوحہ ملک کو صرف اس لئے چھوڑ دیا کہ وہ اپنی شرافت اور اپنی بہادری کو محفوظ رکھ سکے (ظفر اللہ، از آصفی)

کوئی انسان کیا ہے، ہمیشہ غیر معمولی حالات میں معلوم ہوتا ہے اور ان غیر معمولی حالات میں سب سے زیادہ نازک لمحہ ہوتا ہے جب کہ آدمی فاتح اور غالب کی حیثیت میں ہو۔ اپنے کو فتح و غلبہ کے مقام پر پا کر بھی جو شخص شرافت اور انصاف پر قائم رہے وہی وہ انسان ہے جو امتحان میں پورا اترے۔

سچائی کی فتح

تیرھویں صدی ہجری کے وسط کا واقعہ ہے جب کہ ہندستان میں انگریزوں کی حکومت تھی۔ کانڈھلہ (ضلع مظفر نگر، یوپی) کی جات مسجد کی تعمیر شروع ہوئی تو مقامی ہندوؤں اور مسلمانوں میں نزاع شروع ہو گئی۔ یہ نزاع مسجد سے متصل ایک زمین کے بارے میں تھی۔ مسلمان اس زمین کو مسجد کی ملکیت قرار دے کر مسجد میں شامل کرنا چاہتے تھے اور ہندوؤں کا اصرار تھا کہ یہ قدیم مندر کا حصہ ہے۔ جھگڑا بڑھا تو معاملہ عدالت تک پہنچا اور کئی سال تک اس کا مقدمہ چلتا رہا۔

محشریٹ انگریز تھا۔ جو شواہد اس کے سامنے پیش کئے گئے وہ اتنے قطعی نہ تھے کہ انہی بنیاد پر وہ کسی ایک فریق کے حق میں فیصلہ کر سکے۔ بالآخر محشریٹ نے ہندوؤں اور مسلمانوں سے الگ الگ گفتگو کی۔ اس نے مسلمانوں سے کہا کہ کیا تمہاری نظریں کوئی ایسا ہندو ہے جو یہ گواہی دے کہ یہ زمین مسجد کی ملکیت ہے۔ اگر تم کسی ایسے ہندو کا نام بتاؤ تو میں اس کے بیان پر زمین کا فیصلہ کر دوں گا۔ مسلمانوں نے کہا کہ ہم کسی ہندو کا نام نہیں بتا سکتے، یہ ایک مذہبی معاملہ ہے اور ہم کسی ہندو سے یہ امید نہیں کہ ایسے مذہبی معاملہ میں وہ جانب داری کے بغیر بالکل سچ بات کہہ سکے اور یہ گواہی دے کہ زمین مسجد کی ملکیت ہے۔

اس کے بعد انگریز محشریٹ نے ہندوؤں کو بلایا اور کہا کہ کیا تم کسی ایسے مسلمان کا نام بتا سکتے ہو جو تمہارے دعوے کی تصدیق کرے اور یہ گواہی دے کہ یہ زمین مندر کی ملکیت ہے۔ اگر تم ایسے کسی مسلمان کا نام بتاؤ تو میں اس کے بیان پر زمین کا فیصلہ تمہارے حق میں کر دوں گا۔ ہندوؤں نے باہم مشورہ کیا۔ اس کے بعد انھوں نے محشریٹ سے کہا کہ یہ مسئلہ قومی عزت کا معاملہ بن گیا ہے۔ اس لئے بہت مشکل ہے کہ کوئی مسلمان یہ گواہی دے کہ یہ زمین مندر کی ہے تاہم ہماری ہمتی میں ایک بزرگ ایسے ہیں جن سے ہم کو امید ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بولیں گے۔

ہندوؤں نے جس مسلمان کا نام بتایا وہ مولانا مظفر حسین کانڈھلوی کے والد مولانا محمود بخش (م ۱۲۵۸) تھے محشریٹ کا کیپ اس وقت کانڈھلہ کے قریبی موضع ایلم میں تھا۔ اس نے فوراً مولانا محمود بخش کے یہاں پیغام بھیجا کہ وہ کچھری سپنج کر متعلقہ مسئلہ میں اپنا بیان دیں۔ محشریٹ کا بھیجا ہوا آدمی جب مولانا موصوف کے پاس پہنچا تو انھوں نے کہا کہ میں نے قسم کھائی ہے کہ فرنگی کا منہ کبھی نہیں دیکھوں گا۔ محشریٹ نے دوبارہ اپنا چپراسی بھیج کر کہلایا کہ اس کا انتظام رہے گا کہ میں یا کوئی دوسرا انگریز آپ کے سامنے نہ پڑے۔ آپ مہربانی کر کے تشریف لائیں، کیونکہ آپ ہی کے بیان پر ایک اہم مقدمہ کا فیصلہ ہونا ہے۔ اس نے مزید کہلایا کہ آپ

کی مذہبی کتاب قرآن میں یہ حکم ہے کہ کسی معاملہ میں کسی کے پاس گواہی ہو تو وہ اس کو پیش کرے، وہ ہرگز اس کو نہ چھپائے۔

اب مولانا محمود بخش کاندھلوی مجسٹریٹ کی عدالت میں تشریف لائے۔ مجسٹریٹ خیمہ کے اندر دروازہ کے پاس بیٹھ گیا۔ مولانا دروازہ کے پاس باہر کی طرف کھڑے ہو گئے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی بڑی تعداد خیمہ کے باہر جمع تھی۔ ہر ایک نے جیلے جذبات کے ساتھ منتظر تھا کہ دیکھئے آج کیا پیش آتا ہے۔ اندر بیٹھے ہوئے مجسٹریٹ نے بلند آواز سے پوچھا کہ مولانا محمود بخش صاحب یہ بتائیے کہ یہ متنازعہ جگہ ہندوؤں کی ہے یا مسلمانوں کی ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ جگہ ہندوؤں کی ہے، مسلمانوں کا دعویٰ اس کے بارہ میں غلط ہے۔ مجسٹریٹ نے مولانا محمود بخش صاحب کے اسی بیان پر اپنا فیصلہ دے دیا اور وہ زمین ہندوؤں کو مل گئی۔ یہ زمین کاندھلہ کی موجودہ جامع مسجد کی جنوب مشرقی دیوار سے ملی ہوئی ہے۔ ہندوؤں نے مجسٹریٹ کے فیصلہ کے فوراً بعد یہاں مندر تعمیر کر دیا۔ اب بھی اس جگہ پر وہ مندر موجود ہے۔

مسلمان کچری سے اس حال میں واپس ہوئے کہ ان کے چہرے اداس تھے اور ان کے دلوں میں شکست کا احساس چھایا ہوا تھا۔ بہت سے لوگوں نے کہا کہ ”مولوی نے قوم کو فیروں کے سامنے رسوا کر دیا“ مسلمانوں کو معلوم نہ تھا کہ قانون کی عدالت کا فیصلہ اگرچہ ہو چکا ہے مگر اخلاق کی عدالت کا فیصلہ ابھی باقی ہے۔ مولانا محمود بخش کی اس سچائی اور بے لاگ حق پرستی کا ہندوؤں پر بہت اثر پڑا۔ وہ مولانا کی سچائی کے واقعہ میں اس دین کی سچائی کو دیکھنے لگے جس نے ان کے اندر یہ زبردست قوت پیدا کی کہ وہ ایک نہایت نازک قومی معاملہ میں بھی انصاف سے نہیں ہٹے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کاندھلہ کے کئی ہندو خاندان اسلام سے متاثر ہوئے اور مولانا محمود بخش کے ہاتھ پر مسلمان ہو گئے۔ ان نو مسلم خاندانوں میں سے ایک گھرانہ ۱۹۴۷ء تک کاندھلہ میں موجود تھا جو تقسیم کے بعد پاکستان چلا گیا۔

مسلمان اپنا مقدمہ ہار گئے مگر اسلام اپنا مقدمہ جیت گیا۔

دو شخصوں یا گروہوں میں جب بھی کوئی نزاعی معاملہ پیش آتا ہے تو عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ ہر ایک کی نظر مفاد اور مصلحت کی طرف چلی جاتی ہے جس چیز میں بظاہر فائدہ نظر آئے، جو قومی وقار کے مطابق ہو۔ جس میں دنیوی سر بلندی حاصل ہوتی ہو، آدمی بس اسی کی طرف جھک جاتا ہے۔ مگر حقیق کا میانی کا راستہ یہ ہے کہ معاملہ کو حق اور ناحق اور انصاف اور بے انصافی کی نظر سے دیکھا جائے۔ جو طریقہ حق کے مطابق ہو اس کو اختیار کر لیا جائے اور جو طریقہ حق کے خلاف ہو اس کو چھوڑ دیا جائے۔ یہ اصولی موقف ہے اور اس دنیا میں بالآخر اصولی موقف کا میاب ہوتا ہے نہ کہ افادی موقف۔

مفاد کی قربانی

دور اول میں جنوبی اسپین کے بڑے حصہ پر مسلمانوں کی حکومت قائم ہو گئی تھی۔ اس علاقہ کو اصطلاحی طور پر اندلس کہا جاتا ہے۔ تاہم شمالی اسپین کا ایک حصہ ہمیشہ عیسائیوں کے پاس رہا۔ اس بنا پر دونوں قوتوں میں ہمیشہ ٹکراؤ اور مقابلہ کی صورت قائم رہتی تھی۔ گیارہویں صدی عیسوی کے نصف ثانی میں حالات بہت بگڑ گئے۔ مسیحی بادشاہ الفانسو (Alfonso VI) نے ۱۰۸۵ء میں طلیطلہ (Toledo) کو فتح کر کے اپنی طاقت بہت زیادہ بڑھائی۔ اس نے مسلم شہروں پر حملے شروع کر دیے۔ اس کے یہ حملے اتنے شدید تھے کہ یہ اندیشہ محسوس کیا جانے لگا کہ بہت جلد اسپین سے مسلم اقتدار کا خاتمہ ہو جائے گا۔

اس وقت المعتد بن عباد اسپین کے مسلم علاقہ کا سلطان تھا۔ اس کا دار السلطنت اشبیلیہ (Selves) تھا۔ اس کو بہت مشکل حالات میں حکومت کا نظام سنبھالنا پڑا۔ پڑوس کے مسیحی حکمران نہایت بے رحمانہ طور پر مسلم علاقہ کی طرف اقدام کر رہے تھے اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پورا اسپین دوبارہ مسیحی اقتدار کے تحت آجائے گا :

He was destined to rule in difficult times: neighbouring prices were resuming the inexorable advance that in time would bring all of Spain once again under Christian rule. (VII/138)

الفانسونے اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کے بعد المعتد سے اپنے سیفر کے ذریعہ خراج ادا کرنے کا مطالبہ کیا۔ المعتد نے حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے مطالبہ کو تسلیم کر لیا اور اس کو خراج کی رقم بھیج دی۔ یہ خراج چاندی کے سکوں کی صورت میں تھا۔ مسیحی حکمرانوں نے چاندی کے سکے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور اتنے ہی مقدار میں سونے کے سکے کا مطالبہ کیا۔ اب المعتد کو غصہ آگیا۔ اس نے مسیحی سیفر کو قتل کر دیا اور زر خراج کی رستم ادا کرنے سے انکار کر دیا۔

الفانسو اپنی طبیعت کے لحاظ سے ایک حکمران بادشاہ تھا۔ مذکورہ واقعہ کے بعد وہ سخت برہم ہوا اور پختہ ارادہ کر لیا کہ اشبیلیہ پر حملہ کر کے نہ صرف اپنا انتقام لے بلکہ ہمیشہ کے لیے مسلم

سلطنت کا خاتمہ کر دے۔ ظاہری حالات کے اعتبار سے ایسا محسوس ہونے لگا کہ اب اسپین کی باقی ماندہ مسلم سلطنت بھی ختم ہو جائے گی۔ اور پورے ملک پر مسیحیوں کا قبضہ ہو جائے گا۔ حالات کی نزاکت کے پیش نظر الممتمد نے فیصلہ کیا کہ وہ مراکش کے طاقت ور سلطان یوسف بن تاشقین سے مدد طلب کرے۔ دوبارہ یہ ایک بے حد نازک معاملہ تھا۔ کیونکہ ایسا کرنے کی صورت میں یہ واضح اندیشہ تھا کہ الفاسو کی جگہ یوسف بن تاشقین اس کے ملک پر قابض ہو جائے گا۔ اس کے کچھ مشیروں نے سختی کی گئی کے ساتھ اس اندیشہ کا اظہار کیا۔ الممتمد نے اس وقت اپنے مشیروں کو جو تاریخی جواب دیا وہ یہ تھا :

رعى الجمال ولا رعى الخنازير۔ اونٹ کی چرواہی منظور ہے مگر خنزیر کی (لئن اكون اسيلا لدى ملك عربى مسلم ارعى له الجمال خنزير من ان اكون اسيلا لدى ملك الا فرنج ارعى له الخنازير)

چرواہی منظور نہیں۔ اگر میں ایک عربی مسلم بادشاہ کا قیدی بن جاؤں اور اس کے اونٹوں کو چرواؤں تو یہ اس سے بہتر ہے کہ میں فرنگی بادشاہ کا قیدی بنوں اور اس کے خنزیروں کو چرواؤں۔

اس کے بعد الممتمد نے سلطان یوسف بن تاشقین کو مدد کے لیے پیغام بھیجا۔ وہ افریقہ سے ایک بڑا لشکر لے کر روانہ ہوا۔ آبنائے جبرالٹر کو پار کر کے وہ اسپین میں داخل ہوا۔ اس وقت مسلم لشکر کی مجموعی تعداد ۲۰ ہزار تھی۔ اور مسیحی فوج کی تعداد ۵۰ ہزار سے زیادہ تھی۔ ذلالت کے میدان میں دونوں کے درمیان سخت مقابلہ ہوا۔ یہ رمضان کے مہینہ کا پہلا عشرہ تھا۔ مسیحی لشکر کو کثرت تعداد کے باوجود بری طرح شکست ہوئی۔ ابن اثیر نے لکھا ہے کہ شدید مقابلہ میں خود الممتمد کا چہرہ زخمی ہو گیا۔ اس دن اس نے غیر معمولی بہادری دکھائی۔ آخر میں فرنگی فوجوں میں سے صرف تین گھوڑے سوار اپنی جان بچا کر بھاگ سکے۔ مسلمانوں کو غیر معمولی مقدار میں مال غنیمت حاصل ہوا (۱۰۱۵۳)۔

اس واقعہ کا ذکر انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے — ۱۰۸۶ء میں یوسف نے جبرالٹر کی آبنائے کو پار کیا اور ذلالت کے مقام پر مسیحی فوجوں کو بری طرح شکست دی :

فتح کا یہ واقعہ بے حد اہم تھا۔ مسلمانوں کی حکومت اسپین میں اس وقت خاتمہ کے عین کنارے پہنچ گئی تھی۔ مگر اس فتح نے اسپین میں مسلم عہد کو چار سو سال مزید آگے بڑھا دیا۔

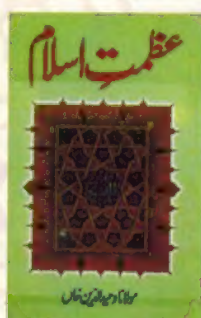
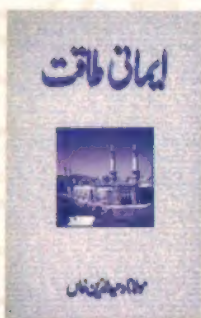
تاہم یہ عظیم سیاسی کامیابی ایک عظیم نفسیاتی قربانی کے ذریعہ ممکن ہو سکی۔ ایسا صرف اس وقت ہوا جب کہ سلطان المعتد نے یہ قربانی دی کہ اس نے اپنے سیاسی مفاد کی پروا نہ کرتے ہوئے یوسف بن تاشقین سے بلا شرط فوجی اتحاد کر لیا۔


زندگی میں بار بار ایسے مواقع آتے ہیں جب کہ آدمی کو قربانی کی حالت سے اوپر اٹھ کر فیصلہ لینا پڑتا ہے۔ جب تنگ نظری کے بجائے وسعت نظری کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب کوتاہ بینی کی جگہ دور بینی کا ثبوت دینا ہوتا ہے۔ جب اس مالی حوصلگی کی ضرورت ہوتی ہے کہ آدمی چھوٹے مقاصد کو نظر انداز کر کے بڑے مقصد کے لیے آگے بڑھ جائے۔

ایک سچا مومن ایسے مواقع پر سب سے زیادہ بہتر پوزیشن میں ہوتا ہے۔ مومن کا آفاقی مزاج اُس کو اس سے بچاتا ہے کہ وہ چھوٹی باتوں میں اس طرح الجھے کہ بڑی بات کو وہ کھودے۔ اس کی نگاہ ہمیشہ اعلیٰ مقاصد پر ہوتی ہے۔ اور جس انسان کی نظر اعلیٰ مقاصد پر ہو وہ کبھی چھوٹی باتوں میں الجھ کر اپنا راستہ کھوٹا نہیں کر سکتا۔

زندگی کے تمام فیصلوں میں اصل اہمیت مزاج کی ہے۔ صحیح مزاج کے لوگ صحیح فیصلہ لیتے ہیں اور غلط مزاج کے لوگ غلط فیصلہ کرتے ہیں۔ ایمان کسی آدمی کے اندر سب سے زیادہ صحیح مزاج بناتا ہے۔ ایمان آدمی کو صحیح ترین طرز پر سوچنے والا بنادیتا ہے۔

مومن ایک با اصول انسان ہے۔ دوسرے لوگ مفاد کے لیے تڑپتے ہیں، مومن اصول کے لیے تڑپتا ہے۔ دوسرے لوگ اپنی ذات کے لیے عمل کرتے ہیں، مومن اپنے سوا دوسروں کے لیے عمل کرتا ہے۔ عام آدمی صرف اُس وقت متحرک ہوتا ہے جب کہ اُس کی اپنی ذات کے لیے کوئی مسئلہ پیدا ہو گیا ہو لیکن ایک مومن اُن ابدی اصولوں کے لیے متحرک ہوتا ہے جن کا تعلق تمام انسانوں سے یکساں طور پر ہو۔



ISLAMIC STUDIES
GOODWORD
www.goodwordbooks.com
ISBN 978-81-7898-838-2

9 788178 988382
₹ 25